لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

ہماری دعوت

ہم علی الاعلان ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ ہم اس ملک میں سنہ، سنہ بتانے نہیں آئے تھے۔ ہم ان ملکوں کو چھوڑ کر جو خود دولت سے بھرے ہوئے تھے یہاں کی دولت میں حصہ لگانے نہیں آئے تھے، ہم ایک مشن، ایک خدمت پر آئے۔ ہم یہاں خدا کے بندوں کو خدا کا بندہ بنانے آئے تھے، یہاں جو مسلمان آئے تھے وہ اخلاق، محبت، خدا پرستی کا پیغام لے کر آئے تھے، انہوں نے اس ملک کو کچھ دیا، لیا نہیں۔ وہ یہاں سے کچھ لینے نہیں آئے تھے، اس کو کچھ دینے آئے تھے، وہ رہنے آئے تھے، یہاں سے جانے کے لئے نہیں آئے تھے، اگر ایسا سوچتے تو اتار کی ایسی شاندار دیادار بھی نہ بناتے، وہ تو خدا پرستی اور انسان دوستی کی دعوت دیتے تھے۔ کہاں کے عرب، کہاں کے عجم، یہ سب ہماری بنائی ہوئی خود ساختہ حدیں ہیں۔ ساری دنیا کے پیدا کرنے والے خالق و مالک اور رزاق اور ساری دنیا کو بغیر شرکت کے چلانے والے ایک اللہ کی طرف سے وہ یہ تعلیم لائے تھے، انہوں نے دنیا سے لئے بغیر، ساری دنیا کی خدمت کی، انہوں نے بیش قیمت موتیوں سے انسانیت کی جھولی بھر دی اور اپنے ہاتھ خالی رکھے۔ اپنے بچوں کی مطلق فکر نہ کی اور اپنے کنبے کی طرف سے آنکھیں بند کر کے پیٹ پر پتھر باندھ باندھ کر لوگوں کی سیوا کی، ان کی تکلیفوں کو راحتوں سے بدلا، جو آیا غربا میں تقسیم کیا، ضرورتمندوں کی جھولیاں بھریں، انہیں خادم اور ملازم دئے اور اپنے بچوں کو بالکل محروم رکھا۔ ایک دفعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر لیٹے تھے۔ جسم پر نشانات پڑ گئے تھے، حضرت عمرؓ نے دیکھا تو کہا اللہ اکبر آپ اللہ کے رسول ہو کر اس تکلیف میں رہیں اور دنیا کا خون چوسنے والے حاکم قالینوں اور مسہریوں پر آرام کریں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا عمر، عیش تو آخرت کا عیش ہے۔

ہم مسلمانوں سے کڑوی بات کہتے ہیں۔ ہم ان سے کہتے ہیں تم نے ان باتوں کو مانا ہے، تمہارا ان پر ایمان ہے۔ تم ان اخلاق و کردار کو چھوڑ کر جانوروں کی سطح پر آ گئے، تم اپنے کردار اور عمل سے اسلام کو بدنام کرتے ہو، اس کے روشن نام کو بٹہ لگاتے ہو۔ تم دنیا کو اسلامی زندگی کی جو چلتی پھرتی فلم دکھلا رہے ہو وہ بڑی افسوسناک ہے، تم نے جو زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے، اس میں کون سی جاذبیت (ATTRACTION) ہے پہلے تم جس راہ سے گزر جاتے تھے نقش چھوڑ جاتے تھے، دیر تک تمہاری خوشبو محسوس ہوتی رہتی تھی، جیسے نسیم کی خوشگواری محسوس ہوتی رہتی ہے۔ مسلمان جدھر سے گزر گئے گلی کوچے معطر کر گئے، اور جہاں سے چلے آئے وہاں سے سفارتیں بھی گئیں کہ ہمارے ملک میں سب کچھ ہے مسلمان نہیں جنہیں دیکھ کر لوگ اپنی زندگی درست کریں اور جو ان کے مقدمات و معاملات میں بے لاگ فیصلہ کریں، ان کی خواہش پر مسلمان بھیجے گئے۔ افسوس اب تم ایسے بن گئے کہ تمہارے نہ ہونے سے ملک میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، آج تک کسی نے اپنے ملک سے ماہرین فن، ڈاکٹروں اور دستکاروں کو نکالا ہے؟ مشرقی پنجاب میں لوہاروں کی ضرورت تھی تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ بسائے گئے، اگر تم میں اخلاقی برتری ہوتی تو اخلاقی ضرورت کا احساس مجبور کرتا کہ تمہیں ملک کی امانت سمجھ کر رکھا جائے، تمہارے دودھ والے پانی ملانے سے پرہیز کرتے، تمہارے درزی کپڑا بچانے کو عیب سمجھتے، تمہارے دستکار اور مزدور محنت سے پورا دن لگ کر کام کرتے، تمہارے حاکم رشوت کو حرام سمجھتے تو دنیا کا کوئی ملک تمہاری جدائی کو گوارا نہ کرتا۔

(مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

بڑھ کے خود منزلِ جاناں نے قدم چوم لیے

مولانا محمد احمد صاحب کی مجلس بعد مغرب ۸ دسمبر بروز اتوار بمکان مولانا حکیم ڈاکٹر عبد العلی صاحب ندویؒ

از: سید سلمان حسینی ندوی

مولانا کی طبیعت دورانِ قیام لکھنؤ مسلسل خراب رہی، بہت ضعف ہو جاتا تھا کہ بات کرنا دشوار ہوتا لیکن اس کے باوجود شفقت و محبت کا یہ عالم کہ تکلیف برداشت کر کے تشریف لے آتے، اور حاضرین کی خاطر طلب انہیں ساکت نہ رہنے دیتی۔ بے تکلف جو بات قلب پر وارد ہوتی اسی سے گفتگو کی ابتدا فرما دیتے۔

فرمایا: اصل چیز محبت ہے، خدا کی محبت پیدا ہو جائے تو پھر سب آسان ہے۔ مولوی عبد اللہ حسنی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت خدا تعالیٰ کی محبت کیسے حاصل ہو؟ فرمایا: صرف کوشش کرنا ہمارا کام ہے، پھر تو خود آغوشِ رحمت ہمیں اٹھا لے گی۔

بڑھ کے خود منزلِ جاناں نے قدم چوم لیے
تھک کے جب بیٹھ گئے کوششِ ناکام کے بعد

فرمایا: دنیا کی محبت اور دنیاوی اغراض کی بنا پر محبت گھٹتی ہے لیکن اللہ کی محبت اور اللہ کے لئے محبت بڑھتی رہتی ہے ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً والذین آمنوا اشد حباً للہ۔

جو گھٹتی بھی ہو وہ محبت نہیں ہے
جو بڑھتی نہ ہو یا وہ الفت نہیں ہے
محبت، محبت تو کہتے ہیں لیکن
محبت نہیں جس میں شدت نہیں ہے

محبت میں "شدت" نہ ہو تو وہ "اشد حباً للہ" کا مصداق نہیں ہو سکتی۔

محبت کے آئین میں سب پرانے
خبردار ہاں اس میں جدت نہیں ہے

محبت قدیم شے ہے، محبت ازلی و ابدی ہے، محبت کا دستور عاشق کا عمل و کردار ہے، وہ نت نئی رسموں کی پابندی کی متحمل نہیں، سنتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیہم دوام عمل ہی محبت ہے، بدعتوں پر عمل کرنا محبت نہیں خواہش نفس کا اتباع ہے لہٰذا محبت کے پیدا کرنے اور اس میں قوت ڈالنے کے لئے یہی ضروری ہے کہ کسی آمیزش کے بغیر اس کا چارہ خالی ہو، اعادہ اللہ سے جب نفرت ہوگی تب ہی اللہ سے محبت ہوگی۔

فرمایا: بدعت کے نام سے جب تک نفرت نہ ہو، سنت کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی ؎

اس کو مل ہی نہیں سکتا کبھی توحید کا جام
جس کی نظروں میں ہے پوشیدہ رسالت کا مقام

مسکرا کر فرمایا، جگر صاحب کا یہ شعر ہے جو انہوں نے اس وقت کہا تھا جب وہ تائب نہیں ہوئے تھے ؎

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

بعد میں جگر صاحب تائب ہو گئے تھے ــــ بہر حال میں نے یہ شعر پڑھا تو ایک نظم تیار ہو گئی (جس میں بڑے عجیب مضامین بڑے دلکش پیرایہ میں بیان ہو گئے)۔

کمال نے تیرے مارا جمال نے مارا
وفورِ شوق نے امرِ محال نے مارا
کبھی خوشی نے کبھی رنج و ملال نے مارا
کبھی یقین کبھی احتمال نے مارا
کسی کو شورشِ مستی و حال نے مارا
مجھے ترے کرمِ بے مثال نے مارا
کبھی جلال برنگِ جمال نے مارا
کبھی جمال برنگِ جلال نے مارا
کسی کو آہ فریبِ کمال نے مارا
میں کیا کہوں مجھے فکرِ کمال نے مارا

مولانا یہ نظم پڑھ رہے تھے اور تاثر و انفعال کا ایک عجیب عالم تھا اور جب آخری شعر پڑھا تو "آہ" ایسی تھی جو جلے کلیجے اور درد مند دل سے نکلی اور ایک تاثر چھوڑ گئی، یہ شعر در اصل مولانا کا حال ہے جو شعر کے حجاب میں مستور دکھانا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر سکوت کے بعد فرمایا:

میں ایک مرتبہ الٰہ آباد میں بہت بیمار تھا، جگر سے اٹھنا دشوار تھا، لوگ عیادت کے لئے آتے تھے، میں گردن میں اپنے مافی الضمیر کو کیا ادا کرتا، بس اس وقت میری زبان سے یہ اشعار جاری ہو گئے ؎

جو ہم پر تیرے ذوق میں آتا ہے وہ ستم ہے
احساس میں عاشق کے وہی لطف و کرم ہے
جو تیری عطائیں گنتا تو ستم ہے

کیا ستم ہے یہ ستم کچھ بھی ہو بہر حال کرم ہے

فرمایا اس کے بعد والا شعر میں نے بہت سے علماء کے سامنے پڑھا سب نے بہت پسند کیا۔

حاصل جسے اسعدِ دستِ فیضانِ کرم ہے
دل اس کا کبھی طور کبھی جائے حرم ہے
ہر زخم میں پوشیدہ جنت کی بہاریں
عشاق سے پوچھو یہ ستم ہے کہ کرم ہے
کسی کی مگر شوق اسے ڈھونڈ رہی ہے
احساس میں اس کے یہ ستم ہے نہ کرم ہے

فرمایا ایک آیا ہی مجلس جہاں جگر نے یہ شعر پڑھا ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ــــ میں نے کہا غالب بھی کتنا نادان ہے عشق سے، حقیقت تو یہ ہے ؎

عشق نے احمد مجلّی کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے نام کے

فرمایا: حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے جہاز پر انتقال ہو جانے کے موقعہ پر کوشش کی گئی کہ ان کی نعش یہاں آ جائے، کوشش کامیاب ہونے والی تھی، لیکن ذرا تاخیر ہو گئی اور بالآخر نعش سمندر میں ڈال دی گئی، اس پر رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ایک صاحب نے مضمون لکھا تھا اور مضمون کے آخر میں یہ شعر ذکر کیا تھا ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

میں نے کہا اس سے تو ان کی محرومی ظاہر ہو رہی ہے اور یہ ان کی شان کے خلاف ہے۔ میں نے کہا ؎

جوشِ جنوں میں توڑ دیا میں نے خود کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا
قسمت کی خوبی کہتے ہیں اس کو عزیزِ من
رحمت کے پردے ڈال کے سر بام آ گیا

فرمایا: اللہ کا عاشق دعوت یہ جانے، زمانہ عالم اسی کا ہو جاتا ہے۔

مقامِ عشق ہے جہاں یکتا اسکو بادہ اے ساقی
میں وہ میخوار ہوں مستانہ بادہ ساغر و پیمانہ ساقی
کوئی اس شغل کو اچھے برے کیسے کہا جائے
کبھی جان ہو ساقی، کبھی یہ ہو پیمانہ ساقی
محبت ہو اسکون و قرار و چین ہو جو محبت
علامت ہے قربانی اور جان نثاری ہو

محبت ہر جنس آتش بجاں رکھتی ہے عاشق کو
نہیں ہو قوت برداشت ہی تک سوز پروانہ

فرمایا: چالیس سال پہلے میں نے یہ اشعار کہے تھے اور کل ہر دوئی میں گنگنا رہا تھا۔

زبان پر ہے الا اللہ الا اللہ جاری ہے
میں اتنا جانتا ہوں اور کچھ آتا نہیں مجھ کو
ملیں کے پیچیدہ گوتری اور ان کی توجہ ہے
تکلف برطرف کہنا ہو سادہ آہ زاری ہے

فرمایا: کسی شاعر نے اپنے شعر میں دل کو جامِ جم سے تشبیہ دی، مجھے یہ تشبیہ پسند نہ آئی، اور اس میں کوئی بلندی نظر نہ آئی تو میں نے کہا ؎

جو دل پر اس کا کرم دیکھتے ہیں
تو ہم دل کو رشکِ ارم دیکھتے ہیں
کرم دیکھتے ہیں، ستم دیکھتے ہیں
محبت کے ساماں بہم دیکھتے ہیں
خوشی دیکھتے ہیں، نہ غم دیکھتے ہیں
ہم ان کی نگاہِ کرم دیکھتے ہیں
فیوض و درِ محترم دیکھتے ہیں
کسے کیا خبر ہم جو ہر دم دیکھتے ہیں

فرمایا: اس میں تصوف کے عمیق مضامین ہیں، لیکن اصطلاحات کی پیچیدگی سے بالکل محفوظ ہے۔

خودکشی کے موقع پر ایک عجیب نظم مولانا نے کہی ہے جو میں پوری نوٹ نہ کر سکا، اس کا یہ شعر بلا کی ندرت اور طرز ادا کا عجیب اچھوتا پن رکھتا ہے ؎

خوشی کو آگ لگا دی خوشی خوشی مر کے
خوشا نصیب کسی کا ملال کے غم سے

پرنٹر، پبلشر سید محمد الحسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر تعمیر حیات ندوۃ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی

کتابت: جلال الدین قیصر ندوی

تعمیرِ حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

زرِ اشتراک اندرونِ ہند مع محصول ڈاک: سالانہ ۱۲ روپئے، ششماہی ساٹھ روپیہ

فی پرچہ: ۶۰ پیسے

بیرونِ ہند مع محصول ڈاک:

بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ اسٹرلنگ

ہوائی ڈاک سے: امریکہ و کناڈا اور یورپین ممالک ۳ پونڈ

افریقہ، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے ممالک ۲ پونڈ

پاکستان: ۳۰ روپئے

بنگلہ دیش: ۱۵ روپئے

جلد نمبر ۱۴ | ۱۰ مئی ۱۹۷۷ء | ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ | شمارہ نمبر ۱۳

اسحٰق جلیس ندوی

پاکستان کا سیاسی بحران

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر میں ہندوستان و پاکستان کے نام سے دو آزاد مملکتیں وجود میں آئیں۔ ہندوستان میں آزادی ملتے ہی دستور سازی کا کام تیز رفتاری سے ہوتا رہا — اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو اپنا دستور بنا کر یہ ملک دنیا کی سب سے بڑی سیکولر جمہوری مملکت قرار پایا۔ اس جمہوری دستور کے تحت ملک میں پہلے عام انتخابات ۱۹۵۲ء میں ہوئے اور ہر پانچ سال بعد مرکز اور ریاستوں میں حق بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخابات ہوتے رہے۔ امسال ۱۹۷۷ء کا پارلیمانی الیکشن چھٹا الیکشن تھا جس میں اس ملک کے باشندوں نے دنیا کے ترقی یافتہ — اور ترقی پذیر ممالک کے سامنے اپنے پختہ شعور اور جمہوری بالغ نظری کا ایسا ثبوت فراہم کیا جس کی نظیر پارلیمانی جمہوریت کی تاریخ میں برطانیہ کے ۱۹۴۵ء کے ان انتخابات میں ملتی ہے جس میں برطانوی عوام نے دوسری جنگ عظیم کے ہیرو ونسٹن چرچل کی کنزرویٹو پارٹی کو مسترد کر کے لیبر پارٹی اور اس کے رہنما کلیمنٹ اٹیلی کو اقتدار سونپا تھا۔

پاکستان جس کی بنیاد ایک نظریاتی مملکت پر پڑی تھی، جس کے قائدین حصول پاکستان کی جدوجہد میں ایک آزاد اسلامی نظامی مملکت کی تشکیل کا وعدہ اور نعرہ لے کر مسلم اکثریت کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہوئے تھے، پاکستان بن جانے کے بعد اپنے وعدوں کو فراموش کر بیٹھے — پاکستان نے دستور کتاب و سنت کی روشنی میں بنانا تھا، اسلامی دستور کے لئے علمی بنیادیں تیار تھیں لیکن ۱۹۵۶ء تک دستور نہ بن سکا۔ چودھری محمد علی کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں دستور بنا، اس کے تحت آزادانہ انتخابات کی نوبت نہیں آئی۔ فوج اور سول سروس کے ایک گروپ نے مرحوم سکندر مرزا صدر پاکستان کی حیثیت سے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ کوئی مستحکم حکومت قائم ہو ہی نہ سکی، نہ انتخابات ہو سکے تھے۔ دس دن وزارتیں بنتی رہیں، ٹوٹتی رہیں اور جوڑ توڑ ہوتا رہا اور بالآخر ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خاں کی قیادت میں وہ فوجی انقلاب آیا جس نے ۱۹۵۶ء کے دستور کو بھی کالعدم قرار دے دیا۔

ایوب خاں کے دس سالہ دورِ حکومت کے زوال کے بعد جو پہلے عام انتخابات ہوئے اس کا نتیجہ بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ مغربی پاکستان میں بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھالا اور قوم کو وہ دستور عطا ہوا جو نام کا اسلامی دستور تھا۔

وزیر اعظم بھٹو حزب اختلاف کا یہ الزام ہے کہ پاکستان کے دو ٹکڑے کرنے کی سازش میں ان کا ہاتھ ہے۔ بھٹو نے جان بوجھ کر اسمبلی کو ڈھاکہ میں بیٹھنے نہ دیا اور اس قرارداد کو پھاڑ دیا جس پر شیخ مجیب الرحمٰن اور وزیر اعظم کے درمیان باہمی گفت و شنید کی توقع تھی۔ یہی اس وقت جب فوجی کارروائی کا سلسلہ شروع ہوا تھا، بھٹو نے سلامتی کونسل سے واک آؤٹ کیا اور نتیجہ پاکستانی افواج کو ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔

بنگلہ دیش کی علیحدگی کے بعد بچے کھچے پاکستان پر بھٹو اور ان کی پارٹی ۱۹۷۱ء سے برسرِ اقتدار ہے۔ حزب اختلاف کا کہنا ہے کہ مسٹر بھٹو کا دورِ اقتدار آمریت، لاقانونیت، مہنگائی، کرپشن، اقربا پروری، بے روزگاری، آزادیِ رائے اور اخبارات پر پابندی کے اعتبار سے گزشتہ تمام حکومتوں پر سبقت لے گیا ہے۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے اعلان کے بعد حزب اختلاف کی نو جماعتوں میں جو اتحاد ہوا وہ برصغیر کی تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ ان نو جماعتوں میں دیوبندی مکتب فکر کی جمعیۃ العلماء اسلام، بریلوی مسلک کی جمعیۃ علماء پاکستان، جماعت اسلامی، جماعت اہل حدیث کے علاوہ ولی خاں کی کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر، اور مارکسی، کونسل مسلم لیگ، تحریک استقلال پاکستان وغیرہ جماعتیں شامل ہیں۔

کل پاکستان قومی اتحاد نے جب اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو عوام نے اس کا زبردست استقبال کیا۔ اپوزیشن کے قومی اتحاد اور بھٹو کی برسرِ اقتدار جماعت پیپلز پارٹی کے جلسے جلوسوں کی نوعیت بالکل وہی تھی جو ہمارے ملک میں برسرِ اقتدار کانگریس اور حزب مخالف کی جنتا پارٹی کی تھی۔ قومی اتحاد کے جلسوں اور جلوسوں میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ پورے جذبہ اور جوش و خروش سے شریک ہوتے تھے، بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی کے جلسوں اور جلوسوں میں پکڑ پکڑ کر لائے جاتے تھے۔ ملکی اور غیر ملکی سیاسی مبصرین … کا متفقہ اندازہ یہ تھا کہ قومی اتحاد اس مرتبہ بھٹو صاحب اور ان کے اقتدار کے لئے بہت بڑے چیلنج کی شکل میں سامنے آیا۔ بھٹو نے دھن، دھونس اور دھاندلی کا طریقہ اختیار کر کے بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی نے پہلے تو اپنے کئی امیدوار بلا مقابلہ کامیاب کروائے، پھر انتخابات میں بھی اسی حکمت عملی کو اپنا کر زبردست اکثریت حاصل کر لی۔ پاکستان قومی اتحاد نے ان نتائج کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا اور بھٹو صاحب کو اقتدار سے بے دخل کرنے اور نئے الیکشن کروانے کی مہم … شروع کر دی جسے عوام کی زبردست حمایت حاصل ہے۔

لیکن ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ کون فریق غالب ہوتا ہے۔ بھٹو نے فوج کو اپنی حمایت میں میدان میں اتار دیا ہے، سابق جنرل ٹکا خاں کو کابینہ میں شامل کر کے انہوں نے اپنی قوت میں اضافہ کر لیا ہے۔ اگر اس بحران نے طول پکڑا تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ موجودہ صورت حال قومی اتحاد کی کوشش ناکام ہو جائے۔

پاکستان جان و مال کی زبردست قربانیوں کے بعد اسلام کی ایک تجربہ گاہ کی حیثیت سے دنیا کے نقشے میں نمودار ہوا تھا لیکن اس کے بانیوں سے لے کر آج تک کے برسرِ اقتدار ٹولے کی بدنیتی اور منافقت کی وجہ سے اسلام ہنوز وہاں مظلوم ہے اور اسلام کے نام لیوا مسلسل بحران کا شکار۔

اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ اسلام کی خاطر کی ہوئی برصغیر کے اسلام دوست عوام کی ان قربانیوں کو بے نتیجہ نہ ہونے دے اور دنیا میں ایک اسلامی فلاحی مملکت اور ایک مثالی اسلامی معاشرہ کو قائم کرنے والوں کی مدد فرمائے۔

کُل ہند حلقۂ پیامِ انسانیت

کا

سہ روزہ کنونشن

بمقام لکھنؤ بتاریخ ۲۰، ۲۱، ۲۲ مئی بروز جمعہ، سنیچر، اتوار

اس پتہ پر رابطہ قائم کیجئے:

کنوینر حلقۂ پیامِ انسانیت، پوسٹ بکس نمبر ۹۳ ندوہ لکھنؤ

مولانا عبدالماجد دریابادی
نقوش و تأثرات

ڈاکٹر سید احتشام ندوی، پروفیسر و صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی کیرالہ

مولانا دریابادی کی شخصیت اردو اور اسلامی لٹریچر پر سایہ دار درخت کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ مولانا نے اسلامی احساسات و جذبات کو ۶۰ برس تک اردو ادب کے قالب میں ڈھالا ہے۔ وہ ادب، سیاست، دینیات، اخلاقیات اور کتابوں پر برجستہ تبصرہ کرتے مگر یہ تبصرے درحقیقت ان کے اسلامی احساسات کے عکاس ہوتے تھے۔ مولانا نے ایک عظیم الشان لٹریچر کو جنم دیا ہے جو فلسفہ سے لیکر صحافت تک پر محیط ہے۔ ایسی نادرۂ روزگار شخصیات مشکل سے وجود میں آتی ہیں۔ مولانا کی شخصیت اس سلسلہ کی کڑی تھی۔

میں جب ۱۹۴۹ء میں ادارہ تعلیمات اسلام لکھنؤ عربی تعلیم کے لئے آیا تو وہاں صدق پابندی سے آتا تھا اس وقت سے برابر صدق پڑھتا رہا اور مولانا سے عقیدت بڑھتی رہی۔ بعد میں چونکہ طبیعت پر ادھر سے اثرات مرتب ہوئے اس لئے مولانا عبدالماجد کے خلاف طبیعت میں خیالات اٹھتے رہے۔ خصوصاً ان کی قادیانیوں سے ہمدردی اور کبھی کبھی جماعت اسلامی پر طنز کی وجہ سے ندوہ کی طالب علمی کے زمانے میں مولانا کی خدمت میں ۱۰ صفحات پر مشتمل ایک طویل خط روانہ کیا جس میں لکھا کہ چونکہ آپ کسی مدرسہ کے فارغ نہیں انگریزی سے عربی کی طرف آئے ہیں اس لئے آپ کے اسلامی خیالات میں پختگی نہیں ہے اور آپ کی طبیعت میں ضد ہے۔ بہت کچھ لکھا تھا اب خیال یہ ہوا تو مولانا نے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ سے فرمایا کہ پتہ لگائیے کہ یہ خط کس طالب علم نے لکھا ہے۔ چونکہ میں نے بے نام کا خط لکھا تھا لہذا پتہ چلنا آسان نہ تھا۔

پھر جب علامہ سید سلیمان ندوی کی وفات پر ان کی یاد میں ایک عظیم الشان جلسہ ندوہ میں منعقد ہوا تو اس وقت پہلی بار قریب سے مولانا کو دیکھا۔ وہ سفید پائجامہ، کرتا، اور سیاہ رنگ کی عبا اور ٹوپی پہنے تھے۔ رنگ سرخ و سفید داڑھی اوسط۔ ظاہر ہے کہ اب سے ۲۵، ۲۰ برس پہلے اتنے بوڑھے نہیں تھے جتنے آخر میں ہو گئے تھے۔ اسی جلسہ میں مولانا [illegible] کو بھی دیکھا اور بہت سے اہل علم کی دید سے نگاہیں شاد ہوئیں۔

جامعہ کی طالب علمی کے زمانے میں مولانا عبدالماجد کا ذکر اکثر مولانا اسلم جیراجپوری سے آتا تھا کیونکہ وہ مجھ سے پوچھتے کہ اس بار مولانا نے کیا لکھا و غیرہ مولانا کی ذات سے تعلق بڑھتا رہا اور میں نے ان کو خطوط لکھے شروع کئے۔ بہت سے خط لکھے۔ مختلف موضوعات پر۔ ان میں بعض کو مولانا نے شائع بھی فرمایا۔

جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات کی جانب سے ان کو اولڈ بوائز لاج میں پارٹی دی گئی تو اس میں میں بھی حاضر تھا اور مولانا کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا مولانا نے فرمایا آپ تو جامعہ میں تھے اور بڑے دلکش خطوط لکھتے تھے۔ مولانا دوبارہ پھر تشریف لائے تو شعبۂ اسلامیات میں کچھ دیر ٹھہرے اس موقع پر بھی مولانا کی خدمت میں حاضری دی۔ اور ان سے گفتگو کا موقع ملا۔

وکٹوریہ یونیورسٹی ترکی میں قیام کے بعد میں نے صدق میں بہت سے مقالے شائع کرائے۔ مولانا نے اکثر ان پر نوٹ بھی لکھے۔ غالباً میں نے اپریل ۱۹۶۶ء میں مولانا سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ آپ آنے کی تاریخ کی اطلاع قبل سے کر دیجئے میں لکھنؤ آ جاؤں گا۔ چونکہ مولانا کے بھتیجے اور داماد حکیم عبدالقوی صاحب لکھنؤ میں مقیم ہیں لہذا مولانا اکثر لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے۔ میں نے لکھا کہ میں مئی میں لکھنؤ آؤں گا اسی وقت آپ کو صحیح تاریخ سے مطلع کر دوں گا۔

چنانچہ میں نے اپنے قیام لکھنؤ کی تاریخ سے مولانا کو مطلع کیا۔ مولانا کا خط آیا کہ میں تو ابھی لکھنؤ سے واپس آیا ہوں۔ اب آپ فلاں تاریخ بارہ بنکی اسٹیشن آ جائیے میں بھی وہاں آ جاؤں گا ناشتہ ساتھ ہی کریں گے۔

میں ذرا پہلے پہونچ گیا مگر جاتے ہی مولانا کی ٹرین [illegible] فوراً مولانا سے ملا اور دونوں فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں گفتگو کے لئے بیٹھ گئے۔ گفتگو کے موضوعات بہت متنوع تھے (جس میں مولانا کے ارشادات کو میں نے قلمبند کر لیا) آتے ہی ویٹنگ روم میں کسی نے [illegible] دکھلا دیا۔ مولانا بہت جز بز ہوئے ہم دونوں اٹھ کر ہوٹل چلے گئے۔ اس سے قبل میں بارہ بنکی اسٹیشن پر کبھی [illegible] تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ ہوٹل ایک مسلمان چلاتا ہے۔ جب بل دینے لگا تو فرمایا کہ میں نے لکھ دیا تھا کہ ناشتہ میری طرف سے۔ چنانچہ مولانا نے اس کا نوٹ نکال کر دیا۔

میں نے عرض کیا کہ مولانا آپ کا خط میں بالکل نہیں پڑھ پاتا بڑی زحمت ہوتی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ میں بلا دیکھے لکھتا ہوں مگر میری ایک لڑکی میرا خط خوب پڑھ لیتی ہے۔ واقعی آخری دور میں مولانا کا اصل خط بے جوڑ کے میرے پاس آیا تھا جس کو ان کی صاحبزادی نے صاف کیا تھا۔ مولانا کی آنکھیں کمزور تھیں اس لئے رات میں لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کرتے تھے۔

دوران گفتگو ذکر نکلا حکیم عبدالقوی صاحب کا میں نے کہا وہ عربی تو نہیں جانتے فرمایا کہ وہ لکھنؤ سے ادیب فاضل کا امتحان عربی میں پاس کر چکے ہیں۔ مولانا سے میں نے عرض کیا تھا کہ ان کی تصانیف کو شائع کرنے اور مقالات کو مرتب کرنے کے لئے ایک اکیڈمی قائم کی جائے اس پر فرمایا کہ میرے اندر بالکل انتظامی صلاحیت نہیں اس سلسلے میں عبدالقوی صاحب شاید کچھ کر سکیں۔ فرمایا کہ عبدالقوی دریاباد آتے ہیں تو کتابوں سے میری ضرورت کی چیزیں تلاش کر کے مجھے بتا دیتے ہیں۔

مولانا سے ذکر ان کی اہلیہ کا نکلا مولانا نے فرمایا کہ وہ شادی سے قبل [illegible] سے علاج کرتے تھے ان کی عزیزہ بیمار تھیں مولانا نے علاج کیا اور یہی وسیلہ بن گیا شادی کا۔ مولانا کی طرف میں نے دیکھا تو ان کا چہرہ افسردہ سا تھا۔ بڑی محبت سے ذکر فرماتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ آپ کا پورے دن کا پروگرام کیا ہوتا ہے فرمایا صبح طلوع آفتاب سے قبل اپنے گھر کی چھت پر ٹہل لیتا ہوں پھر صبح سے شام تک لکھنا پڑھنا رہتا ہوں۔ [illegible] ڈیڑھ میل ضرور ہو جاتا ہوگا۔ فرمایا کہ [illegible] مولانا کو یہ احساس تھا کہ دریاباد اسٹیشن سے قصبہ تک راستہ بہت خراب ہے اس بار [illegible] آ جاتے تھے۔ بالآخر انہوں نے بارہ بنکی اسٹیشن کا انتخاب فرمایا اگرچہ مجھے اس بات سے تکلیف ہوئی کہ مولانا میرے لئے زحمت فرما کر تشریف لائے مگر مولانا کی خواہش کا احترام تھا ورنہ تمنا یہ تھی کہ مولانا کے گھر جا کر ان سے ملتا۔ دوسری ٹرین آنے میں دیر تھی۔ بڑا کافی طویل وقفہ مل گیا اور میں نے خوب دل کھول کر گفتگو کی۔ اس زمانہ میں مولانا تفسیر قرآن پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ فرمایا کہ وہ صبح سے شام تک اسی میں مشغول رہتے ہیں اور دوپہر کو قیلولہ بھی نہیں فرماتے۔ میں نے عرض کیا کہ عمر کے تقاضے سے ضعف محسوس فرماتے ہوں گے فرمایا نہیں ابھی تو میں دو تین میل چل سکتا ہوں۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس کی تھی۔

مولانا نے فرمایا کہ پہلے انہوں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ و تفسیر بائبل کی زبان میں کیا تھا پھر دوبارہ ترجمے نئے اسلوب میں کیا۔ مولانا نے بتایا کہ پہلے وہ شہر لکھنؤ میں مقیم تھے مگر وہاں کے جلسے جلوس [illegible] اور ملاقات کرنے والوں کا ہجوم ان باتوں سے گھبرا کر یکسوئی کے لئے اپنے گھر چلے گئے۔

مولانا کے ساتھ جتنی دیر رہا گفتگو متنوع رہی۔ ان کی ذات میں علامہ شبلی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد اور دوسرے بزرگوں کے نقوش ذہن میں ابھرتے رہے۔ اچانک مولانا نے فرمایا آپ مولانا [illegible] صاحب سے نہیں ملے؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا ملئے۔

مولانا کی ذات سراپا صفات تھی۔ انہوں نے عمر کو علمی و ادبی کام کے پوری عمر ایک ہی دھن میں گذار دی۔ ان کی ذات خود ایک انجمن تھی۔ اگرچہ وہ اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں باضابطہ ندوی نہ تھے مگر دونوں نے علامہ شبلی سے فیض حاصل کیا تھا۔ اور شبلی اسکول کے اہم ارکان میں تھے۔ ان کا ہفتہ وار "صدق" ندوہ کا ہمنوا اور حامی تھا۔ ان کے ادبی کاموں پر میں نے ایک الگ مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس لئے یہاں صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں جن کا علم مجھے ذاتی طور پر ہے۔

میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ ندوائی ہیں؟ فرمایا ہاں میں ندوائی ہوں البتہ لکھا صرف ایک بار ہے جب کہ وصی احمد ندوائی پر مقالہ تحریر کیا تھا اس وقت نام کے ساتھ عبدالماجد ندوائی لکھا تھا۔

[illegible] کہ مولانا طلبہ سے [illegible] تھے مگر جب [illegible] تو مولانا کو بڑا دلکش و عجیب انسان پایا خیالات میں

تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں بچوں کی تربیت

مفتون کوثری

یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ بچے قوم و معاشرہ کی بنیاد ہیں ان کی صحیح تربیت سے ملت و ملک اور قوم و معاشرہ ترقی کرتا ہے اور ان کی غلط تربیت سے بگڑ جاتا ہے۔ آج کا بیٹا کل کا باپ، آج کی بچی کل کی ماں اور آج کا بچہ کل کا بزرگ بن کر ملک و ملت کی ذمہ داریاں سنبھالے گا۔ آج جسے ہم کسی توجہ کے لائق نہیں سمجھتے کل وہی ہماری تمام تر توجہات کا مرکز بن جائے گا ہمارے مقاصد حیات اور اغراض زندگی کی تکمیل و بقا آئندہ نسلوں کے شاندار مستقبل پر انحصار رکھتی ہے۔ ہر عورت کی فطرت میں ماں بننے کی خواہش ہوتی ہے اور خدا کا ہزار ہزار شکر ادا کیا جانا چاہئے اگر وہ ماں بنا دی جائے لیکن ساتھ ہی اس مسرت و شادمانی میں اُن ذمہ داریوں کو بھی سمجھنا چاہئے جو اولاد کی پیدائش کے بعد والدین پر عائد ہوتی ہیں۔

بہترین تعلیمات اور مذہبی و دنیاوی دونوں لحاظ سے اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کی ہے اور اُنھیں ذہن میں رکھئے تو یہ معلوم ہوگا کہ اس صورت میں والدین سے کتنی قربانیاں چاہتا ہے۔ مال کی قربانی، وقت کی قربانی، ترجیحات کی قربانی، اپنے مشاغل کی قربانی اور اپنے شوق کی قربانی، اپنی روزمرہ کی زندگی میں اتنی احتیاط اور ہوشیاری برتنی چاہئے کہ بچہ اس آئینے میں خود دیکھتا رہے کہ شرم اور حیا باقی رہ جائے، ماحول ایسا پاکیزہ و پاکباز بنانا چاہئے کہ بچوں تک بد کرداریوں اور بد گفتاریوں کی ہوا بھی نہ پہنچے کیونکہ بچہ سادہ کتاب ہوتا ہے جو تحریر آپ اس میں بنائیں گے وہی اس کی زیب و زینت بنیں گے۔ اُن سے بد عہدی نہ کیجئے، جھوٹا وعدہ نہ کیجئے، اُنھیں دھوکا نہ دیجئے۔ اگر آپ اُن کی زبان سے آپ اور جناب سننا چاہتے ہیں تو خود اُن سے آپ اور جناب کہئے۔ وہ آپ کو بیڑی سگریٹ پیتا دیکھیں گے تو خود بھی اس کی نقل کریں گے آپ کو جو کریں سامنے بیں غیر غیر کر پان چباتا دیکھیں گے تو وہ بھی بیڑ کر اور فکر کر پان پئیں گے۔

جن گھروں میں جو عمل کیا جاتا ہے ہر بچہ ویسا ہی بنتا چلا جاتا ہے بچے بھی کسی وراثت و تربیت کے ذریعہ ان امور کی نقل کرتے ہیں جو بڑے

بچوں اور دماغوں میں ایسا ماحول بنا کر ابتدائے عمر ہی سے ان پر عمل پیرائی شروع کر دیتے ہیں اور اس عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی جب انھیں نماز پر ڈانٹ ڈپٹ اور زدو کوب کا حکم ہے وہ اعمال حسنہ کے پابند اور نیک کاموں پر کاربند ہو چلتے ہیں۔ انھیں جیل کرتے کبوتر اور چڑے کی کہانیوں کے بجائے ہمارے دینی اسلاف اور اسلامی بزرگوں کے واقعات سنائے جائیں، تو بچپن ہی سے اُن کے حافظے اور یادداشت میں کہیں حضرت عمرؓ جلوہ پاش نظر آئیں گے اور کہیں حضرت خالدؓ۔ کہیں محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی واقعات کی تابانیاں جلوہ گر ہوں گی تو کہیں صحابیات کے ایمان افروز کارنامے۔ تاہم یہ سب والدین کی توجہات اور تعلیمات ہی سے ممکن ہو سکتا ہے جو ہمارا انسانی، اخلاقی اور معاشرتی فرض ہے لیکن قرآن جانے اسلام کی گیرائی اور گہرائی، وسعت و بصیرت اور رحمت۔

رادت پر جنی اس فرض کی تکمیل بھی عبادت و اطاعت کے دائرہ میں شامل کر کے دنیاوی انعامات کے ساتھ انعامات اُخروی کا بھی مستحق قرار دے دیا گیا ہے اور ایسے والدین کو گلزار جنت کے مقام کا حقدار گردانا گیا ہے۔ عرب میں طلوع اسلام سے قبل لڑکیوں کی حالت قابل رحم تھی تو خصوصاً لڑکیوں کی تربیت و تعلیم کے ساتھ زیادہ کوشش رکھے گئے جید دو یا تین لڑکیوں کی پرورش پر حضورؐ نے باغ فردوس میں اپنی ہمسائیگی کا شرف بخشنے کی بشارت دی ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دامن تربیت میں حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو لے کر انھیں بچپنے سے بڑا کر کے اور بچپن سے جوانی تک اپنی نگرانی میں ان کی تربیت و تعلیم کر کے پیروان اسلام کے لئے بہت سی روایتیں کھول دی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین نے اُن نسلوں کو پروان چڑھایا جنہوں نے دنیا میں اخلاقی اور دینی اسلامی کا پرچم مشرق و مغرب اور ایشیا و یورپ میں بلند ہوتا دکھا۔ شادی بیاہ کے معاملات، جہیز

نکاح اور پھر اس کے بعد شوہر کے گھر اور خسرال کے بہاں کی زندگی کو خوشگوار بنانے اور نبانے دیکھئے کے اصول و رموز سے متعلق دین میں اصحاب رسولؐ اور اُن کے صحابہ کرامؓ کی بیاں و زوجات ہی سے آگاہ و باخبر اور بابصیرت ہو سکے۔ حضرت فاطمہؓ کو کتنا مختصر جہیز دیا گیا اور آج کل کے جلک اور جہیز کی گراں باری اور ہوکے والوں کی زندگیوں کا کس طرح استحصال کیا گیا یہ ہمیں بتاری ہے اگر ہم نسخہ کیمیا کے ہوتے ہوئے ناکام و نامراد رہیں۔ پامال و برباد ہو گئے ہیں۔ شادی بیاہ میں ہزاروں غیر اسلامی مراسم کو رواج دے دیں۔ اور اُن کی ابتدائی اصول شرعی پر ترجیح رکھیں۔ شادی ہی پر کیا منحصر ہے علی میں زندگی ہی کیا موت میں بھی غیر شرعی رسوم کے تلے دبی ہوئی ہے اور انسانیت سسک رہی ہے بلکہ جا رہی ہے۔ ان کے لئے اصلاحیں کی جا رہی ہیں قوانین بنائے جا رہے ہیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ جتنے قانون بنتے ہیں اتنے ہی قانون شکنی کے طور طریق ڈھونڈ لئے جاتے ہیں عجب نہیں ہے کہ وہ قوم ہی اُن آئینوں

خرافات اور بربادیوں کا شکار ہے جو خود کو حامل دین متین، اور صاحب قرآن مبین کہلاتی ہے جس کے سامنے علم و تعلیم ہی کے نہیں، عمل و کردار کے بھی ہزاروں نمونے ہیں۔ ایک ذرا سی جرأت و حوصلہ کی ضرورت ہے، اپنے خول سے اپنے جال سے اور اپنے غلاف سے باہر نکلنے کے لئے افسوس یہ ہے کہ یہ جال اور جالے ہمارے گرد ایسے تنے ہوئے ہیں کہ ہم ان رسموں اور رواجوں سے باہر نکل نہیں پاتے۔ دینی تعلیم سے غفلت کا یہ ثمرہ ہے باعلی حیثیت سے خود کو بے حس و بے بس سمجھ کر غلط دھارے کے رحم و کرم پر اپنے آپ کو چھوڑ دینے کا نتیجہ ہے۔

وہ لڑکیاں جو ہمارے لئے زحمت وہ رحمت ہیں ہماری نظروں میں آفت وبالی جاں گئی ہیں جن بچوں کے لئے ارشاد نبوی ہے انہم ملی ریحان اللہ "کہ بچے خدا کے باغ کے پھول ہیں"، وہ مصیبت و عذاب سمجھے جانے لگے ہیں جب سے شفقت و محبت کی نعمت ان کی موت۔

عادت سے غفلت اندوزی، اُن گفتگو سے اجتناب اور پھر اُن کی تربیت و تعلیم پرورش و آسائش کے سلسلے میں مشغلوں کی قربانی۔ اس کے صلہ میں عبادت و ثواب کا حکم۔ دین اسلام کی کتنی برکتیں اور حسبی بچے ہیں جن سے محروم ہیں ۔۔۔۔ نصیبیں ہیں اور جن کی سعودی بڑا خسارہ ہے، ہمارے نوجے دور پر شرعی اقرار اور مذہبی اطوار جلوہ گر ہو جائیں تو نظریں پر ضیا اور قلوب مجلی ہو سکتے ہیں، جس بچہ کے کانوں میں ابتدا ہی سے اذان و اقامت کی آواز پہنچے تو وہ شریعت و مذہب کے بال و پر سنا ہے اور اذان اختیار کر کے خود اپنے لئے بھی برکت و رحمت بن سکتا ہے، اور اپنے والدین کے لئے بھی اور اپنے معاشرہ کے لئے بھی۔

بات اصل میں یہ ہے کہ ۔۔۔ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔ ہمارا یقین ہونا چاہئے کہ قرآنی تعلیمات اور حیات بابرکات میں ہر مشکل کا حل موجود ہے خواہ وہ اُلجھن خارجی ہو یا داخلی ۔۔ ہنگامی ہو یا دوامی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ علم و عمل ہمارے ہر پہلوئے حیات کا شیرازہ بکتی ہے۔ بچوں کی حیثیت میں حضورؐ کے کردار و گفتار میں پر کھیئے ۔۔۔۔

حضرت حلیمہؓ حضورؐ کی دودھ پلائی تھیں جو قبیلہ سعد سے تعلق رکھتی تھیں، وہی قبیلہ سعد جس کے متعلق حضورؐ فخر سے فرماتے تھے کہ میری لسانی تربیت خود اللہ عزوجل نے فرمائی ہے اور میرے ذوق ادب کو نشتر بنا دیا ہے، نیز یہ کہ قبیلہ سعد کی فصاحت آموز فضا میں پرورش پائی ہے۔ آپ کی دودھ شریک بہن حضرت شیما تھیں اُن کے گاؤں میں اسلامی فوج سے لڑائی ہوئی تو جنگی قیدیوں میں یہ بھی گرفتار ہو کر آئیں، فوجیوں نے آپ کے روبرو پیش کیا کہ یہ آپ کو اپنا دودھ شریک بھائی بتاتی ہیں، آپ نے پہچانا تو آنسو بھر آئے، آگے بیٹھنے کو اپنی چادر بچھا دی۔ فرمایا تم چاہو تو بھائی کے پاس رہو اور چاہو تو اپنے گاؤں چلی جاؤ۔ اُن کی خواہش پر انہیں بڑے احترام سے اونٹ اور بکریاں دے کر واپس بھیج دیا۔

دودھ شریک بہن کی محبت کے بعد بیٹے اور بیٹی کی محبت بھی شاندار جھلکتی ہے۔ جناب ابراہیمؓ کو رضاعت کے لئے مدینہ کے بالائی حصے میں رکھا گیا تھا آپ کافی فاصلہ طے کر کے وہاں تشریف لے جاتے گھر میں دھواں بھرا ہوتا لیکن آپ بچے کو گود میں لے کر پیار کرتے۔

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

دل گداز سانحہ ارتحال مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

۱۳۹۷ھ

از مولانا ابو الکمال شاد اعظمی مدرس مدرسہ اشرفیہ تعلیم الاسلام شیخہ (بارہ بنکی)

گلشن علم و فن ہوا برباد
زندہ دل زندہ دار تھے ماجد
تھے یہ بی-اے مگر تھے طالب
تھے فہیم و ذکی و متواضع
تھی عجیب و غریب یہ ہستی
صدق کے وہ مدیر دانشور
سن یہ ستانوے و تیرہ سو
از دل شاد عیسوی سن ہے

ہو گئی گل چراغ دریاباد
دار عقبیٰ میں ہو گئے آباد
عربی و فارسی کے تھے استاد
دل میں ان کے بسا تھا اللہ آباد
تھے یہ نقاد و جامع اضداد
دار فانی سے ہو گئے آزاد
ہم بھی کو اب ہو گیا ہے یاد
شفقت تاریخ دیکھ لو اے شاد
۱۹۷۷ء

عبد ماجد جوار رحمت میں
شاد لکھ دو کہ ہو گئے ہے

غزل

شکیل طفیل احمد مدنی۔ لکچرر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی۔ الہ آباد

لاکھ حائل ہوئیں ظلمتیں راہ میں سینۂ شب مگر چیر کر آئے ہیں
ہم ہی تو ہیں نقیب اس نئی صبح کے ہم ہی لے کر نوید سحر آئے ہیں
آپ کی انجمن ہائے شایان شان ہے کے نذرانہ خوب تر آئے ہیں
آپ کی یاد سے جگمگاتا ہوا لے کے ہم اک دل معتبر آئے ہیں
مست نظروں سے اپنی انہیں بھی ذرا دست سرشار کرئے خدا کے لئے
ساقیا تیری محفل میں کچھ تشنہ لب با دل خستہ با چشم تر آئے ہیں
اف وہ انوار کی بارشیں الاماں چشم بینا میں بھی خیرگی آ گئی
میں یہ سمجھا کہ جیسے تری بزم میں چاند تارے فلک سے اتر آئے ہیں
خالی دامن نہ لوٹے بفضل خدا ہم بھی معدن عشق و عرفان سے
ان کی محفل سے جب بھی اٹھے دوستو بھر کے دامن میں لعل و گہر آئے ہیں
میرا پندار ٹوٹا تو اکر ہمیں ہوش ہی آئی جو دل پر تو وہ بھی نہیں
مل نہ پائی بلندی نئے اور کہیں راہ میں کتنے ہی بام و در آئے ہیں
یہ مرا انتخاب نظر ہی تو ہے جس نے دنیا میں بس اک تمہیں کو چنا
ورنہ اس عالم رنگ و بو میں تو یوں ایک سے ایک شمس و قمر آئے ہیں
آج احساس غم بھی زیادہ نہیں زخم دل بھی کسی نے کریدا نہیں
پھر بھی بیٹھے بٹھائے خدا جانے کیوں آج کیوں اشک آنکھوں میں بھر آئے ہیں
چند آنسو اور اک سجدۂ بے ریا اور ترے عاشقوں کی خصوصی دعا
وار فانی سے اے داور حشر ہم بس یہی لے کے زاد سفر آئے ہیں
دشمنوں کی عداوت کا کیا ذکر ہے حق کی خاطر زباں جب بھی کھولی گئی
دوستوں کی صفیں بھی کھڑی جس طرف سنگ اسی سمت سے بیشتر آئے ہیں
عہد حاضر کی تہذیب پر تبصرہ آپ بتلائیے کس زباں سے کروں
شرم سے جھک گئی ہیں نگاہیں جہاں ایسے بھی کچھ مناظر نظر آئے ہیں
خون دل سے چمن سینچتے ہی رہے خدمت گلستاں میں لگے ہی رہے
گرچہ کہتے ہیں الزام اس راہ میں مستقل اے طفیل اپنے سر آئے ہیں

پتہ صاف اور مکمل لکھا کریں۔

بقیہ صفحہ ... نقوش و تاثرات

میں اعتدال نظر آیا۔ فرمانے لگے کہ ترقی کر کے معراج کم کرتے ہیں اور طلبا بھی ہیں مشغول کر دیتے ہیں۔

قصوف کا ذکر نکلا تو کہنے لگے کہ تصوف کو مستقل پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ پورا ایک نظام بن گیا حالانکہ یہ مقصود نہیں۔

مولانا اس دوران چونکہ قرآن مجید پر کام کر رہے تھے ذکر نکلا معجزہ شق القمر کا۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہوتا تو سارے عالم میں دیکھا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتربت الساعۃ و انشق القمر سے مراد ہے القمر۔ قرب قیامت ایسا ہونے والا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ انہوں نے مولانا ظفر الملک کے ساتھ مل کر ہفتہ وار "سچ" جاری کیا پھر مولانا اور ظفر الملک میں اختلاف ہو گئے اور انہوں نے اپنا رسالہ "صدق" کے نام سے جاری کیا، پھر بولے کہ ظفر الملک کیساتھ اکثر لوگوں کو اختلافات پیدا ہو جاتے تھے۔

ندوہ کے جشن بہاراں میں نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوہ کے مہمان خانے کے باہر ہم لوگ بیٹھے تھے کہ ایک کار آ کر رکی دیکھا تو مولانا عبد الماجد دریابادی تشریف فرما ہیں مگر ضعف و اضمحلال کا یہ عالم تھا کہ دو آدمیوں نے سہارا دیا تو مولانا باہر نکلے۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ مولانا مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا میں نے مصافحہ کیا۔ چہرہ پر زردی سی چھائی تھی مگر ہلکا تھا بلکہ چہرہ بھی نورانی ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ عشر کا پیمانہ تو محدود ہے۔ اسی محدود و مختصر مدت میں انسان کو اسکے اعمال سے ناپا جا سکتا ہے۔

مولانا نے اپنے نگارشوں میں جس طرح بیٹھ کر علم و ادب، دین و ثقافت کی خدمت کی ہے۔ زبان و اسلوب کے جس طرح جلوے دکھائے ہیں اردو صحافت کو جس طرح نکھارا اور سنوارا ہے۔ حسن طنز نگاری کو جس طرح آگے بڑھایا ہے اور فکر و فن کا جس طرح مظاہرہ کیا ہے وہ اردو ادب اسلامیات کے موضوعات پر حیات ابدی بخشنے کے لئے کافی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بقیہ صفحہ تعلیمات نبوی ...

حضرت فاطمہؓ کو اپنی جان کا ٹکڑا فرمایا۔ اُن کے ہاں سے تو ر خیرہ ہوتے وہ آتیں تو اٹھ کر استقبال کرتے۔ بڑی شفقت سے پاس بٹھاتے۔ سفر پر تشریف لے جاتے تو آپ سے مل کر جاتے۔ واپس تشریف لاتے تو مسجد میں دو رکعت نفل پڑھ کر ان کے گھر تشریف لے جاتے۔ تسبیح فاطمہؓ حضرت فاطمہؓ کو بیش قیمت عطیہ کے ساتھ امت کو بھی گراں قدر انعام ہے جو ہزاروں صحابہ کرام اور اولیائے عظام کے اکثر و بیشتر معمول میں رہی ہے اور جس کا بیش آج بھی ہر عامل کو پہنچتا ہے۔

اُن کے صاحبزادوں حضرت حسنؓ سے بہت پیار کرتے، اُن کو کندھوں پر سوار کرتے۔ اُن کا کے سے لگا تے وہ شان کے طور پر آپ کے گیسوئے مبارک پکڑ لیتے۔ حالت نماز میں بھی انہیں کندھوں پر بٹھا دیتے۔ سجدہ کو طویل فرما دیتے کتاب محسن انسانیت (از نعیم صدیقی) میں ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ ایک بار فزاری حابس نے آپؐ کو جناب حسنؓ کا بوسہ لیتے دیکھا تو تعجب سے کہا کہ میرے دس بچے ہیں میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا مگر آپ بوسہ لیتے ہیں۔ فرمایا جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

عبد اللہ بن بشیر کے ہاتھ ان کی والدہ نے ہدیہ کے طور پر انگور حضورؐ کی خدمت میں بھیجے۔ صاحبزادے راستہ میں چٹ کر گئے بعد میں معاملہ کھلا تو آپ پیار سے عبد اللہ کا کان پکڑ کر کہتے یا غدر یا غدر۔ او دھوکے باز، دھوکے باز۔

حضرت انسؓ کو کبھی پیار سے کہا یاذا الاذنین۔ او دو کانوں والے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ پیار کرتے دعا فرماتے۔ بچے لائے جاتے تو ان کو گود میں لے لیتے۔ سفر سے آ رہے ہوتے تو جو بچے راستے میں ملتا اسے سواری پر بٹھا لیتے۔ چھوٹا ہوتا تو آگے۔ بڑا ہوتا تو پیچھے۔ فصل کا میوہ پہلی بار آتا تو دعائے برکت مانگ کر کم عمر بچوں کو دے دیتے۔

اس محبت و تربیت سے ہی ہماری اولاد کیوں ذہنی شعوری بنے گی۔ یہ نسل کیوں قوم و ملک کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ یہ بچے کیوں دین و مذہب کی تو انائی کا سبب ہوں گے۔

صلی اللہ علیہ وسلم۔

بنگلور میں

"جامعہ فرقانیہ" کے قیام کا منصوبہ

جنوبی ہند میں ندوۃ العلماء کی ایک شاخ

از محمد شہاب الدین ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور

واقعہ یہ ہے کہ آج مسلمان اپنی نئی نسلوں کی صحیح اور جامع تعلیم کے بارے میں بحران و سرگرداں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ آج ہماری درس گاہیں اور مدرسے دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک طرف عربی و دینی مدرسے ہیں جو اسلامی تہذیب و ثقافت کے علمبردار ہیں تو دوسری طرف انگریزی کالج ہیں جو نئے علوم کے نمائندہ ہیں۔ اور بدقسمتی سے ان دونوں میں کوئی ربط و تعاون موجود نہیں ہے۔ یہ دونوں طبقے حالات سے بے خبر اور ایک دوسرے کے لئے اجنبی دکھائی دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہر مسلمان مجبور ہے کہ وہ اپنے لخت جگر کو کسی کے حوالے کرے۔ اگر وہ دین کا خیال کرتا ہے تو اس کی نظروں میں دنیا فوت ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اگر دنیا کا خیال کرتا ہے تو دین چھوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ لہٰذا وہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اس کو کیا کرنا چاہئے؟ کیونکہ بدقسمتی سے ہمارے پاس ایسے مدارس موجود نہیں ہیں جو قدیم و جدید دونوں علوم کے جامع ہوں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ مالدار اور ذہین بچے زیادہ تر انگریزی مدارس کے حوالے کر دئے جاتے ہیں اور عربی مدارس کے حصے میں نادار اور کم ذہین بچے آتے ہیں۔ دین و دنیا کی اس تفریق سے ملت کو سخت نقصان ہو رہا ہے۔ اور یہ دونوں طبقے دو متحارب گروہوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

جب تک تعلیم کی یہ دوئی ختم نہیں ہوتی ملت اسلامیہ حقیقی ترقی نہیں کرسکتی اور نہ وہ زندگی کے میدان میں ایسے قابل افراد کو لاسکتی ہے جو موجودہ حالات کو سمجھیں اور نئے مسائل اور جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے معاشرے کی تعمیر کرسکیں اور زندگی کے ہر شعبے میں نئے سرے سے اصلاح کرکے ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرسکیں، تاکہ موجودہ سائنسی دور میں مسلم قوم بلکہ سارا عالم اسلام دوسری ترقی یافتہ اقوام کے شانہ بشانہ کھڑا ہو سکے۔ ہمارے ایک ہاتھ میں قرآن ہو تو دوسرے ہاتھ میں علوم و فنون جدیدہ۔ ہر کوئی [illegible]

قائم کرکے افراط و تفریط سے بچنا چاہئے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جس طرح عربی زبان قرآن و حدیث کے علوم و معارف کی کنجی ہے، جس کی تحصیل کے بغیر اسلام کے صحیح منشاء اور اس کے ذہن و مزاج کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا ممکن نہیں، بالکل اسی طرح انگریزی زبان تمام علوم جدیدہ کی چابی ہے، جس کو حاصل کئے بغیر جدید علوم اور جدید فلسفوں کے رموز و اسرار پر عبور حاصل کرنا ممکن نہیں۔ مگر افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے حالات سے بے خبر اور ایک دوسرے سے بے نیاز چلے جا رہے ہیں۔ ایک طرف عربی مدارس میں زیادہ تر تین سو سال پرانا نصاب تعلیم رائج ہے جو جدید تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا اور دوسری طرف ہمارے کالج ہیں جو انگریزی دور کی نشانی اور محض کلرک ڈھالنے کی مشین نظر آتے ہیں۔ اگر بالاستثناء ہمارے کسی کالج میں دینیات کی کچھ تعلیم ہوتی ہے یا کسی عربی مدرسے میں نئے علوم کی کچھ ہوا پائی بھی جاتی ہے تو اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور اس بارے میں بہت زیادہ افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔ نصاب تعلیم گرچہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو جب تک پورے اخلاص کے ساتھ اس پر عمل نہ کیا جائے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوسکتے۔

اس سلسلے میں دونوں طبقوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں اور بے بنیاد اندیشے پائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ دونوں دھارے الگ ہی الگ بہہ رہے ہیں۔ عصر جدید کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک جامع اور متوازن نظام تعلیم اپنایا جائے اور جتنا زیادہ جدید مسائل کو حل کیا جائے۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ قیامت تک تمام اقوام عالم کی اصلاح و رہنمائی کے لئے امت مسلمہ ہی ذمہ دار بنائی گئی ہے اور اس کے کندھوں پر اصلاح عالم کا بار ڈالا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:۔

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر"

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (پوری نوع انسانی) کے لئے تیار کی گئی ہے۔ (تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ) تم انہیں معروف (جانی پہچانی حقیقت) کی تلقین کرتے رہو اور منکر (ناشناس) سے روکتے رہو۔

اس فرمان خداوندی کا تقاضا ہے کہ ہم ایک ایسی جماعت پیدا کریں جو موجودہ معاشرہ کے ہر نقص کو دور کرسکے، معاشرہ کے ہر طبقے اور ہر خانے میں گھس کر اس کی اصلاح کرسکے، ہر علم و فن کے جوہر کو علیحدہ علیحدہ کرسکے اور ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرکے پورے عالم انسانی کے سدھار کا کام کرسکے۔ مگر یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ ہم تمام مروجہ علوم و فنون کا جائزہ لیں، اقوام عالم کے عروج و زوال پر نگاہ رکھیں، معاشرتی (سوشل) علوم کا مطالعہ کریں اور مختلف معاشروں اور سوسائٹیوں کی ایک ایک ادا کو نظر میں رکھیں۔

اس کام کے لئے ایک ہمہ گیر منصوبے کی ضرورت ہے اور نئے ٹیکنیکل شعور اور نئے ہتھیاروں سے لیس ایک ٹیم درکار ہے۔ مگر یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک کہ موجودہ نظام تعلیم کو بدلا نہ جائے اور جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے جامع مدرسے اور کالج قائم نہ کئے جائیں جو بیک وقت اخلاقی تربیت گاہیں بھی ہوں اور دینی و دنیوی علوم کے جامع مراکز بھی۔ موجودہ حالات میں عصری علوم کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم جدید علوم سے واقفیت حاصل کئے بغیر مذہب اسلام کی صحیح وکالت نہیں کرسکتے اور نہ ان علوم کی جانب سے مذہب پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دے سکتے ہیں۔ جدید افکار و نظریات سے واقفیت ہر دور میں ضروری ہے۔ اس کے بغیر نیا علم کلام وجود میں نہیں آسکتا اور اقوام عالم پر فکری و نظریاتی اعتبار سے برتری نہیں ہوسکتی۔

"ندوۃ العلماء" کی تقلید کی ضرورت:

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ہندوستان کا وہ مایہ ناز مدرسہ ہے جس نے اس سلسلے میں دلیرانہ اقدام کرکے ایک اچھی مثال قائم کردی ہے جس کے نصاب تعلیم میں اسلامی علوم کے پہلو بہ پہلو عصری علوم کو بھی بڑی فراخدلی کے ساتھ جگہ دی گئی ہے۔ یہ مدرسہ سالہا سال سے مسلسل تجربات کر رہا ہے جس کے نتائج کافی حوصلہ افزا ہیں۔ ہمارے عربی و اسلامی مدرسوں کو زمانے کے مزاج اور اس کے تقاضوں کے پیش نظر ندوۃ العلماء کی پوری تقلید کرنی چاہئے تاکہ عالم اسلامی کی قیادت زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح طور پر ہوسکے۔ اس وقت ہم کو اسلامی اقدار کے دفاع کے لئے ہر قسم کے عصری ہتھیاروں سے مسلح ہونے کی ضرورت ہے۔ ہمارے موجودہ نصاب تعلیم سے بعض غیر ضروری اجزاء کو خارج کرکے چند نئے اور مفید علوم کو شامل کیا جاسکے اور ایسے مدرسے اور کالج زیادہ سے زیادہ تعداد میں قائم کئے جائیں جن میں عربی و انگریزی دونوں کی تعلیم مساوی طور پر دی جاتی ہو۔ اس انقلابی اقدام کے بغیر موجودہ مسائل حل نہیں ہوسکتے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہماری عملی زندگی سے علیحدگی اور پیش پا افتادہ مسائل سے مسلسل گریز و فرار کے باعث نہ صرف علماء پر حرف آرہا ہے، بلکہ اسلام بھی طعن و تشنیع سے بچ نہیں سکا ہے۔ حالانکہ وہ ایک مکمل اور ابدی دین ہونے کا داعی و علمبردار ہے۔ جو دین اپنے دائمی اور ابدی ہونے کا مدعی ہو اور ہر زمانے کے حالات اور تقاضوں سے نمٹنے کا دعوی رکھتا ہو، اس کے پیرو نئے علوم اور نئے مسائل سے ناآشنا ہوکر اس کی وکالت کس طرح کرسکتے ہیں؟ اور عصری حالات اور تقاضوں کو سمجھے بغیر موجودہ علمی و تہذیبی مسائل کس طرح حل کرسکتے ہیں؟

ندوۃ العلماء کی جنوبی شاخ:

اسی نظریہ اور مقصد کے تحت جنوبی ہند کے مرکزی شہر بنگلور میں "جامعہ فرقانیہ" کے نام سے ایک عربی مدرسہ قائم کیا جارہا ہے جو ان شاء اللہ جنوبی ہند کا ندوۃ العلماء ہوگا۔ مگر اس قسم کا مدرسہ قائم کرنا کوئی

آسان بات نہیں ہے، اس کے لئے بے انتہا اور انتھک جدوجہد کرنی ہوگی، وسائل کی ضرورت اور کارکنوں کی ایک ٹیم درکار ہوگی اور یہ کام اہم بھی ہے اور مشکل بھی۔ مگر ہمیں قرآن حکیم "حتیٰ یغیروا ما بانفسہم" کا مژدۂ جانفزا سنایا گیا ہے۔ لہٰذا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے بھی نہیں رہ سکتے۔ ہمارا کام تو سعی و جہد ہے، کامیابی عطا کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ اگر اخلاص کے ساتھ کام کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کامیابی ضرور عطا فرمائے گا۔

تدریج کے اصول کے تحت ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ ہم اس کام کو دو مرحلوں میں مکمل کریں:

پہلے مرحلے میں ایسا تعلیمی ادارہ بنائیں جس میں انگریزی کالجوں کے فارغ شدہ ذہین اور منتخب طلبہ کے لئے وظائف جاری کرکے انہیں عربی زبان اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے، اسی طرح عربی مدارس کے فارغ شدہ باصلاحیت اور ہونہار افراد کے لئے انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اس طرح ہم کم سے کم مدت میں بہتر نتائج پیدا کر سکتے ہیں اور دوسرے مرحلے میں وہ طریقہ اختیار کریں جس میں شروع سے طلبہ کو علوم اسلامیہ اور علوم جدیدہ کی تعلیم متوازی طور پر دی جائے۔

بہرحال ایک تحقیقی ادارے کے لئے جب تک رفقائے کار (فیلوس) کی ایک جماعت فراہم نہ ہو جائے، خاطر خواہ کام ہونا بہت مشکل ہے اور رفقاء کی تیاری کے لئے ایک مدرسے کا وجود نہایت ضروری ہے، اس طرح یہ دونوں کام لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے فرقانیہ اکیڈمی کے اغراض و مقاصد میں شروع ہی سے ایک معیاری درسگاہ "جامعہ فرقانیہ" کے نام سے قائم کرنے کا منصوبہ بھی شامل ہے، جس کی تحریک ماہنامہ "تعمیر فکر" کے ذریعہ چلائی گئی۔ اس اقدام سے دوہرے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد اس مسئلہ پر پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ غور کریں اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی خاطر کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں ورنہ آنے والا وقت ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ حالات کے رُخ اور زمانے کے تقاضوں سے صرف نظر کرنا ملی حیثیت سے خودکشی کا باعث ہوگا، حالانکہ دیگر قومیں اپنے آپ کو جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح کر رہی ہیں۔

فرقانیہ عربک ایوننگ کالج:

ہمارا نظریہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو اگر اسلام سے کما حقہٗ روشناس کرا دیا جائے تو وہ موجودہ دور کے تقاضے کے مطابق زیادہ بہتر طور پر اسلام کی خدمت کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارے پیش نظر جدید بنیادوں پر عربی زبان کی تعلیم و ترویج کا منصوبہ بھی ہے، یعنی خواہش مند افراد کو جدید عربی زبان میں لکھنے، پڑھنے اور بولنے کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ وہ ایک عربی معاشرہ میں پوری طرح کھپ سکیں۔ آج کل چونکہ ہمارے تعلقات مختلف عرب ممالک سے بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں اور بہت سے لوگوں کو عربی زبان کی تحصیل کی ضرورت بڑی شدت کے ساتھ محسوس ہو رہی ہے، لہٰذا اس طرف بھی فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

مگر چونکہ آجکل ہندوستان کے عربی مدارس میں عربی زبان سکھانے کا جو طریقہ عام طور سے رائج ہے وہ بہت فرسودہ ہے۔ ضرورت ہے کہ جدید طریقے اور نئے اصولوں کے تحت اس زبان کی تعلیم دی جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم "جامعہ فرقانیہ" کے تحت ایک ایسا ایوننگ کالج بھی قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں ہمارے نوجوانوں اور دیگر ضرورت مندوں کو کم سے کم مدت میں اتنی عربی سکھا دی جائے کہ وہ اس زبان میں لکھ پڑھ اور بول بھی سکیں اور قرآن و حدیث کو بھی بخوبی سمجھ سکیں۔ اس مقصد کے لئے مختصر طور پر ایک سالہ اور دو سالہ کورس جاری کرنے کا ارادہ ہے۔

یہ کام فرقانیہ اکیڈمی کچھ عرصے سے، وسائل کی کمی کی بنا پر محدود طور پر کر رہی ہے، مگر ضرورت ہے کہ اس کام کو وسیع پیمانے پر کیا جائے، اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف مقامات پر کوچنگ کلاسس کے طور پر سنٹرس قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ بہتر نتائج برآمد ہو سکیں۔

جامعہ فرقانیہ کا نظام تعلیم:

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں ہمارے نوجوانوں کو علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ سے بھی روشناس کرانا ضروری ہے تاکہ پیش پا افتادہ ملی و انسانی مسائل حل ہوں اور عالم انسانی کی صحیح فکری رہنمائی عمل میں آئے۔ اس منصوبے کے تحت مجوزہ جامعہ کی پوری تعلیمی مدت کو حسب ذیل تین مراحل میں تقسیم کرکے بتدریج علوم اسلامیہ اور علوم جدیدہ کی تکمیل کرائی جا سکتی ہے۔

۱۔ ہائی اسکول لیول۔ ابتدائی پانچ سال کی مدت میں مولوی کورس کی ضروری کتابیں اور حکومت کے نصاب کے مطابق ہائی اسکول کورس مکمل کرا دیا جائے۔ اس مختصر نصاب کی تکمیل کے بعد فارغ ہونے والے کو "مولوی عالم" کی سند دی جائے۔

نوٹ: اتنی تعلیم اگر تمام مسلمان بچوں کے لئے لازمی کر دی جائے (بشرطیکہ اس کا انتظام ہو سکے) تو ہماری ملی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب آ سکتا ہے۔ اس بنیادی تعلیم کے بعد ہمارے نوجوانوں کو کسی بھی علم کی مزید تعلیم دی جا سکتی ہے۔

۲۔ پری یونیورسٹی لیول۔ مذکورہ کورس مکمل کرنے کے بعد مزید تین سالہ مدت میں مولوی کورس کی اونچی تعلیم اور سرکاری نصاب کے مطابق پری یونیورسٹی کا کورس مکمل کرایا جائے۔ اس کورس کی تکمیل کے بعد فارغ ہونے والے کو "مولوی فاضل" کی سند دی جائے۔

۳۔ بی۔ اے لیول۔ پھر اس کے بعد مزید دو سالہ مدت میں عربی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ یا علوم جدیدہ[1] میں سے کسی ایک مضمون میں خصوصیت کے ساتھ تکمیل کرائی جائے، جس کے بعد اس کو "مولوی کامل" کی سند دی جائے۔

نوٹ: یہ صرف ایک ذہنی خاکہ ہے۔ ماہرین غور و فکر کرکے ان مراحل کی مدت اور طریقۂ کار میں مناسب تبدیلی اور کمی بیشی کر سکتے ہیں۔

"فرقانیہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ" کے قیام کا منصوبہ

ہائی اسکول لیول کے بعد جو طلبہ اپنی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے مزید تعلیم حاصل نہ کر سکتے ہوں تو انہیں ہمارے مجوزہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخل کرکے انہیں فنی تعلیم دی جائے تاکہ وہ معاشی میدان میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں، مثلاً کتابت، جلد سازی، طباعت، الیکٹریکل فٹنگ، نجاری، بیڈ ورک، پلاسٹک انڈسٹری اور کاٹیج انڈسٹری کے مختلف فنون وغیرہ۔

نیز ایسے طلبہ فنی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اگر چاہیں تو ہمارے مجوزہ ایوننگ کالج میں داخلہ لے کر اپنی مزید تعلیم بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔

یہ اسکیم اگر صحیح طور پر روبہ عمل آ جائے تو ہماری ملی زندگی کی کایا پلٹ سکتی ہے اور اتنے کثیر فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو بیان سے باہر ہیں، بشرطیکہ منظم پیمانے پر کام کیا جائے۔

ملت کا درد رکھنے والے چند باہمت اور مہم جو افراد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہو جائیں تو یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے جو انجام نہ پا سکتا ہو۔

جب تک یہ کام نہیں ہوگا، ہمارے ملی مسائل حل نہیں ہو سکتے اور نہ اقوام عالم کے مقابلے میں ہمارا اخلاقی و تعلیمی معیار اونچا ہو سکتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے ۔۔۔ اور اس موضوع پر بحث و مباحثے بھی ہو چکے ہیں کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی تعلیم کا جوڑ صحیح نہیں ہے، یا دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی تعلیم حاصل کرنا بہت مشکل اور کار دشوار ہے وغیرہ۔ لیکن ہم نے اوپر جو نظام اور خاکہ پیش کیا ہے اس کے تحت یہ دونوں مقاصد (حسب قابلیت) بخوبی حاصل ہو سکتے ہیں۔

اصل بات قابلیت اور صلاحیت کی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام طلبہ کے لئے دونوں قسم کی نصابی اور فنی تعلیم لازم کر دی جائے۔ بلکہ یہ طریقہ بہت مضر اور نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ہاں صلاحیت و قابلیت کے مطابق انہیں مختلف لائنوں میں لگایا اور کھپایا جا سکتا ہے۔

فرقانیہ ہاسٹل کے قیام کا منصوبہ

شہر کے وسط میں ایک ایسا ہاسٹل (HOSTEL) چلانے کا منصوبہ بھی ہے جس میں شہر کے مختلف سرکاری و غیر سرکاری کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان طلبہ قیام کر سکیں اور ان کی تربیت اور فکری نشوونما اسلامی خطوط پر عمل میں آ سکے۔ ہماری ملت کے وسیع تر مفاد کے لئے اس طرح کا ایک آئیڈیل ادارہ چلانا بہت ضروری ہے۔

اس اسکیم کے مطابق ایک منصوبہ بند طریقہ پر شام کے فارغ اوقات میں چند ہلکے پھلکے دینی و اصلاحی پروگرام اور ہفتہ واری اجتماعات رکھے جا سکتے ہیں جن کے ذریعہ ان کی صحیح ذہن سازی ہو اور موجودہ خرابیوں کا سدباب بھی ہو سکے۔ نیز اس کے علاوہ اس مجوزہ ہاسٹل میں یونیورسٹی کے کوچنگ کلاسس بھی بڑی کامیابی کے ساتھ چلائے جا سکتے ہیں۔ اس میں ایک لکچر ہال اور ایک لائبریری کا ہونا بہت ضروری ہے۔

۞ ۞

---

[1] مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، سائنس، فلسفہ، معاشیات، سماجیات وغیرہ۔

خطبۂ صدارت

آل کیرالا اردو کانفرنس منعقدہ مئی ۱۹۸۶ء

پہلا سیشن ——— مندوبین

جناب ڈاکٹر سید الاولیٰ صاحب (ایم۔ ایس سی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی) پرنسپل انجمن آرٹس اینڈ سائنس کالج، بھٹکل (این۔ کے) کرناٹک اسٹیٹ

۷۸۶

محترم حاضرین اور مندوبین کانفرنس!

میں مجلس منتظمہ اور جنرل سیکریٹری جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب آل کیرالا اردو کونسل کا سراپا سپاس ہوں کہ انہوں نے مجھے گوشۂ عزلت سے نکال کر اردو کی بزم سجایا اور اس کونسل کے جلسۂ اول کی صدارت کے لئے منتخب کر کے عزت افزائی کا ثبوت دیا۔ میں ان کی اس عزت افزائی پر دل کی گہرائیوں سے ان کا ممنون و مشکور ہوں۔

عنوان اردو:

آج آپ کے سامنے جو لوگ موجود ہیں وہ محض اس وجہ سے یہاں تشریف لائے ہیں کہ انہیں ہندوستان کی ایک ایسی زبان سے پیار و محبت ہے جس کی شیرینی و دلآویزی دوسری زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس زبان کو عرف عام میں "اردو" کہتے ہیں۔

کیرالا ہندوستان کی وہ ریاست ہے جو شمال ہند سے کم از کم ۲ ہزار میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور جس کی ریاستی زبان ملیالم ہے اس کے باوجود یہاں کے باشندوں کا زبان اردو سے یہ دلچسپی اور شوق بھی ان کی زبان دوستی کی غماز ہے اور کچھ نہیں۔ اس سے زبان اردو کی اپنی خصوصیت کا اعتراف ہوتا ہے اور دوست و دشمن کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ "اردو" ہندوستان کی وہ واحد زبان ہے جو عوام کے دلوں سے قریب تر ہے اور جو ان کے احساسات و جذبات کی بہتر ترجمانی کرتی ہے اور آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ بات معجزہ سے کم نہیں کہ جس کیرالا میں ۵۰ سال قبل اردو کا نام بہت سے لوگوں کو معلوم نہ تھا آج اسی کیرالا میں اتنی بڑی شاندار کانفرنس ہو رہی ہے اور جگہ جگہ اردو تعلیم کے ادارے اور [illegible] کی شکل میں اس کی کامیابی پر گواہ ہیں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اردو صرف شمالی ہند کی نہیں ہے بلکہ جنوبی ہند کی بھی زبان ہے یا اس کو یوں کہیے کہ پورے ملک کی زبان ہے۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو زبان، نسل اور رنگ کی بنیاد پر انسانوں میں فرق کو جائز نہیں سمجھتے ہیں۔ مگر اس حقیقت سے آپ جیسے اہل علم اور صاحب بصیرت حضرات بخوبی واقف ہیں کہ اگر کسی قوم کو ختم کرنا ہو تو اس کا رشتہ اس کے ماضی سے کاٹ دینا چاہئے اور ماضی سے کاٹ دینے کا سب سے آسان نسخہ یہ ہے کہ اس کی مادری زبان ختم کر دی جائے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہندوستان ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے زیر انتظام رہا۔ مختلف وجوہ کی بنا پر اس زمانہ میں سرکاری زبان عربی کے بجائے فارسی رہی۔ اس کے بعد مختلف زبانوں کے اتصال اور میل جول سے زبان اردو بنی جس کی پوری تاریخ بیان کرنا آپ جیسے ذی علم حضرات کے سامنے ضروری نہیں۔ البتہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مسلمانوں نے اس زبان کو فارسی کے مقابل میں اپنایا اور چونکہ حکومت اور ریاست باقی تھی اس لئے آسانی سے اپنی تمام مذہبی تعلیم اور ثقافتی معلومات اس زبان میں منتقل کر دیا اس طرح فارسی کا چلن اُٹھ جانے کے باوجود اُن کا رشتہ ان کے ماضی سے قائم رہا اور زوال حکومت کی بنا پر ہزار پریشانیوں اور مزاحمتوں کے باوجود اپنے کلچر اور اپنی ثقافت سے ناآشنا نہ ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں مذہبی اور تہذیبی ذخیرہ کو منتقل کر کے ہمارے اسلاف نے ہم پر وہ احسان کیا ہے جس سے ہم کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ آج اردو صرف مسلمانوں کی مادری زبان ہی نہیں ہے بلکہ یہ اُن کی تہذیب، اُن کی ثقافت اور اُن کے مذہب کے امین ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ اس لئے فطری طور پر مسلمان دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اس زبان سے زیادہ تعلق رکھنے پر مجبور ہیں۔

اس وطن عزیز میں مسلمانوں کی دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک بحیثیت امت مسلمہ کے اسلام سے وابستگی اور ربط باہمی دوسری بحیثیت شہری برادران وطن کے دکھ درد میں شریک ہونا اور ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینا۔ یہ دونوں حیثیتیں کسی طرح ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ معاون و مددگار ہیں بشرطیکہ اُنھیں صاف دل اور وسعت نظر سے دیکھا اور سمجھا جائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا سب سے پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ خود ایک نظریۂ حیات کے حامل ہیں، ایک عالمگیر تہذیب و تمدن کے وارث ہیں اور انسانیت کی بہتر صورت گری کے لئے اُن کے پاس خود اپنے اصول و ضوابط ہیں جن سے دست بردار ہونے کے لئے وہ کبھی تیار نہیں۔ بعض کوتاہ نظر جو ان اصولوں سے ناواقف ہیں، سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا اصول تہذیب و تمدن اور نظام معاشرت وغیرہ اس دور میں قابل قبول نہیں ہو سکتے اس لئے انہیں ترک کر دینا چاہئے۔ مگر چونکہ مسلمان مجبوراً اس کے لئے راضی نہیں ہیں اس لئے [illegible] اکثر چلتی رہتی ہے۔ علامہ اقبال نے اسی بات کو ایک جگہ اس طرح پیش کیا ہے ؎

"خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی"

یہی اسی خصوصی تہذیب و تمدن کی بقا و حفاظت کے لئے مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ملک میں پھیلے ہوئے تمام ہم عقیدہ لوگوں سے ربط رکھیں اور اتحاد امت کے لئے مسلسل سعی کرتے جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے یہ بات بھی ناگزیر ہے کہ کوئی زبان ایسی ہو جو ملک کے طول و عرض میں آسانی سے سمجھی جا سکتی ہو اور جس کے ذریعہ ان کے اسلاف سے ان کا رشتہ باقی رہ سکے اور جس میں ان کے اکابر کے علمی اور تہذیبی کارنامے ہوں۔

ظاہر ہے ان خصوصیات کی حامل ہندوستان کی تمام زبانوں میں سے صرف اردو ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اتحاد امت کے لئے اردو ہی کو رابطہ کی زبان قرار دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ریاست کے مسلمانوں نے اپنی اپنی جگہ پر اردو کی تعلیم کا انتظام کیا تاکہ مسلمانوں کا ربط باہمی اور اسلامی رشتہ ٹوٹنے نہ پائے اور "فاصلہ" کی بنا پر آپس میں بیگانگی اور اجنبیت کا احساس پیدا نہ ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ بنیادی احساس ہے جس نے کیرالا کے اُن مسلمانوں کو آل کیرالا اردو کونسل پر مجبور کیا جن کی ریاستی اور مادری زبان ملیالم ہے۔

دوسرا محرک جو اس کونسل کے انعقاد کا باعث بنا وہ خود اردو زبان کی اپنی خصوصیت ہے، اس کی لطافت و شیرینی ہے۔ احساسات و جذبات کی بہتر ترجمانی ہے اور ایک بہتر تہذیب کی نمائندگی ہے اسی حیثیت میں وہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے یکساں عزیز اور دلآویز ہے۔ ہر وہ شخص جسے اس زبان کی لطافت، اسلوب اور حسن پسند ہے۔ وہ اردو کا بہی خواہ ہے اور اس کونسل کا داعی ہے۔ مگر یہ بات [illegible] اردو کی نگہبانی [illegible] ہونی چاہئے کہ انسان اپنے خیالات اور تہذیب [illegible] دوسری زبانوں کے ادب میں بھی پھیلاتا ہے اسی طرح ہر زبان کے ادب میں کچھ ایسی باتیں ضرور ہوتی ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ آپ کو جس کسی صنف میں دلچسپی ہو ملکی اور غیر ملکی ادب سے استفادہ کرنا چاہئے اور اردو ادب کو مختلف الفاظ، خیالات اور انداز سے مالا مال کرنا چاہئے۔ زبان کی بنیاد پر دیواریں کھینچ کر بند رہنا صحیح نہیں ہے۔ بہرحال چونکہ انسان کو سمجھنا ہے، اسکے خیالات و تجربات سے فائدہ اُٹھانا ہے اس لئے ہر انسانی زبان سے محبت رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر [illegible]

انسانی ورثہ سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں ہے۔

عزیزانِ گرامی!

آپ نے شہر کے باغوں میں چہل قدمی کی ہوگی اور اپنے پائیں باغ میں بھی گوشہ خرام رہے ہوں گے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اسی باغ میں جہاں صبح کو ایسے جانور آتے ہیں جو فرش زمین پر پڑی ہوئی گندی چیزوں سے اپنی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں، وہیں بلبل بھی آتی ہے اور گل و لالہ اور سرو و سمن سے اپنا ذوق جمال پورا کرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ محض اس وجہ سے کہ دونوں کا مذاق مختلف ہے۔ اسی طرح جس سماج میں ہم اور آپ رہتے ہیں اس میں جہاں باغ کی گندگیوں کی طرح برائیاں ہیں وہیں حسین و دلکش پھولوں کی طرح اچھائیاں بھی ہیں۔ اب یہ ادیب و شاعر کے ذوق اور فطرت سلیم پر منحصر ہے کہ ان میں سے کس کو اپنے موضوع کے لئے انتخاب کرتا ہے۔ ظاہر ہے جیسا جس کا ذوق اور معیار ذوق ہوگا ویسی ہی اس کی پسند ہوگی۔ اگر کسی ادیب و شاعر کا ذہن اعلیٰ اقدار اور شرف انسانی کے احساس سے خالی ہے تو ظاہر ہے کہ اسکے جذبات و احساسات جانوروں کے جذبات و احساسات سے زیادہ بلند نہیں ہو سکتے۔ نتیجۃً اس کی شاعری یا اس کا ادب شکم و جنس ہی کے گرد گھومے گا۔ اس کے برعکس اگر کسی ادیب و شاعر کا دماغ و دل اعلیٰ اقدار اور شرف انسانی کے احساس سے بھرپور ہے تو پھر اس کے ادب میں شکم و جنس کا موضوع بھی بلند اخلاقی اقدار کے پرتو میں اس طرح بیان ہوگا کہ انسانی جذبات میں حیوانیت کا احساس نہ جاگے بلکہ قاری کے ذہن کا رُخ شرف انسانی کی اس منزل کی طرف مڑتا چلا جائے جسے ایک اچھے انسانی سماج کے لئے ناگزیر تصور کیا جاتا ہے۔ جس طرح عقیدہ سے بیگانہ دانشور سماج کے لئے ایٹم بم سے زیادہ خطرناک ہیں اسی طرح سماج کے لئے وہی شاعر و ادیب مفید رہے ہیں جنھیں کسی نہ کسی نظریۂ حیات اور نظام فکر کا شعور رہا ہے۔ ہاں ان کے نظریے سے اختلاف تو اس کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی اس لئے کہ اگر آپ ایک نظریۂ حیات کو صحیح سمجھتے ہیں تو دوسرا کسی اور نظریۂ زندگی کو پسند کرے گا اسی طرح اختلاف کا ہونا لازمی و فطری امر ہے۔ لہٰذا ان اختلافات کو علمی بنیاد پر زیر بحث و زیر تنقید لانا بھی ناگزیر ہے جسے گوارہ کرنا چاہئے کیونکہ اسی بحث و تمحیص سے زندگی کے نئے نئے رُخ اور حل سامنے آتے ہیں اور ذہن کو سوچنے، سمجھنے اور پرکھنے اور کسی [illegible] پر پہنچنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ [illegible] چاہئے کہ اپنا دامن کسی نہ کسی نظریۂ فکر اور فلسفۂ حیات سے ضرور وابستہ رکھیں اور اس نظریۂ حیات کو سرسری طور پر نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر اور خوب پرکھ کر انتخاب کیجئے تاکہ وہ آپ کے دل کی دھڑکن بن جائے اور آپ کی صلاحیتوں کو صحیح رخ پر لگائے تاکہ آپ گل و بلبل، لب و رخسار، زلف مشکیں اور ہجر و وصال کے گرفتار محض بن کر نہ رہ جائیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ باتیں زندگی کے حقائق میں سے نہیں ہیں مگر یہ ساری زندگی نہیں ہے اس لئے کہ ؎

اور بھی کام ہیں دنیا میں محبت کے سوا

موجودہ زمانے میں بعض لوگ چاہے انسان کو انسان کہنے میں تکلف کرتے ہوں مگر انسان کا "سماجی جانور" ہونا انہیں بھی تسلیم ہے۔ لفظ "سماجی" کا یہ اضافہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان اپنی فطرت و جبلت میں دوسرے انسانوں سے ربط و تعلق رکھنے کا داعیہ رکھتا ہے اور جہاں اسے اپنی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے وہاں وہ سماج سے بھی بیگانہ نہیں رہتا اور نہیں رہ سکتا ہے۔ انسانی سماج نے اس ربط و تعلق کی بنا پر چاہے کوئی گروہ کسی مذہبی عقیدہ کو مانتا یا نہ مانتا ہو مگر وہ انسانی سماج کے لئے چند صفات کو ہمیشہ سے پسند کرتا رہا ہے اور بعض اوصاف کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہے۔ سچائی، انصاف، باہمی ہمدردی، ضبط نفس، اولوالعزمی، فرض شناسی، احساس ذمہ داری اور امانت داری ہمیشہ سے انسانی سماج کے پسندیدہ اوصاف رہے ہیں۔ اسکے برعکس جھوٹ، ظلم، بدعہدی، خود غرضی، تنگ نفسی، بزدلی، نافرض شناسی، کام چوری اور غیر ذمہ داری جیسی صفات کبھی بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی گئیں۔ اسی طرح چوری، زنا، قتل، ڈاکہ، جعل سازی، رشوت خوری اور ضمیر فروشی کبھی بھی اچھے افعال نہیں سمجھے گئے۔ انسانیت اپنا اچھا عنصر انہیں لوگوں کو سمجھتی رہی ہے جو پاک دامن، راست باز، باضمیر اور خیر اندیش ہوں۔ جن کا ظاہر و باطن یکساں اور قول و فعل مطابق ہو۔ جو امن سے رہیں اور دوسروں کو امن سے رہنے دیں۔ جن کی ذات سے ہر ایک کو خیر کی امید ہو اور کسی کو برائی کا اندیشہ نہ ہو۔ آپ لوگ جو اردو زبان کی محبت میں یہاں دور دراز سے کھنچ کر آئے ہیں اور خصوصیت سے وہ حضرات جو اہل قلم ہیں، صاحب طرز ادیب و شاعر ہیں، افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ میں اُن سے نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ وہ اپنا احتساب کریں کہ کیا واقعی آپ کا قلم اُن انسانی اعلیٰ صفات کو پروان چڑھانے کے کام آتا ہے جو انسانیت کا مشترکہ ورثہ اور اصل جوہر ہیں۔ اگر ایسا ہے تو سماج کو آپ پر فخر ہے اور آپ کا سماج پر احسان ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو میں آپ کے منصب و مقام کو یاد دلاتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ آپ سماج کی تعمیری صلاحیتوں کو وقف کر دیں اور ان انسانی صفات کو اپنے قلم کی صلاحیتوں سے آب و تاب بخشیں جن کے اپنانے سے ایک اچھا اور صالح معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

آج مختلف زبانوں میں جو ادب ایجاد ہو رہا ہے اس کا بیشتر حصہ لذت شکم و جنس کے گرد گھومتا ہے۔ سستی، جنسی واقعات، جرائم کی نقالی اور گندی رومانی کہانیاں اس سے بھری ہیں۔ ظاہر ہے ایسا ادب سماج کے ذہن کو کسی پاکیزہ معاشرہ کے لئے نہیں ابھار سکتا ہے جہاں محنت، ایثار، فرض شناسی، باہمی خیر خواہی اور اعلیٰ کردار کی ضرورت ہے۔ اردو ادب کو انسانی ہمدردی کی عکاسی میں اتنا آگے بڑھ جانا چاہیے کہ ہمارے بعد آنے والے کہ اُردو ادب میں اچھے دل کی آواز سنائی دے اور اُسے سماج کی بھلائی کی امید ہی اسی اردو ادب سے ہوں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے ادیب، شاعر اور افسانہ نویسوں نے عوام کا مزاج کافی حد تک بگاڑ دیا ہے اور انھیں ایسی لذتیت کا شکار بنا دیا ہے کہ سنجیدہ ادب انھیں بالکل نہیں بھاتا۔ اس صورت حال کے پیدا کرنے میں فلمی ادب و اداکاری کا بڑا ہاتھ ہے جس کا معیار روز بروز پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے مگر ان سب کے باوجود ہمارے ادیب اور اہل قلم ہی اس تباہی کو روک سکتے ہیں اور عوام کا مزاج بدل سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کریں۔ اب انھیں اس عزم راسخ کے ساتھ ادب کے میدان میں قلم اُٹھانا ہے کہ انسانی فطرت کے مخفی تاروں کو چھیڑنا ہے تاکہ خیر اُبھرے اور انسانیت کو اپنی متاع گمشدہ کا پتہ مل جائے۔ یہ کام ہے مشکل لیکن "انسان اور انسانیت" سے پیار ہے تو اس کو اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ ؎

لفظ پاکیزہ کا گریز تو بہت کرتا ہے
رہ تو رستہ ہے کہ ہر گام پہ کام دیتا ہے

(اقبالؔ)

اُردو والوں کو چاہیے کہ وہ اس طرف اپنی ذہنی فرصت میں توجہ دیں کیونکہ یہ پورے ملک کو سنوارنے اور بنانے کا مسئلہ ہے۔ اگر اُردو والوں نے اپنے نگارشات قلم سے ہندوستانی سماج کا رُخ ان انسانی صفات کی طرف موڑ دیا تو یہ پورے ملک پر ایک عظیم احسان ہوگا اور خود اہل ملک اُردو کو ایک ناگزیر زبان اور خانہ سے جانے کہ اس سے قریب سے قریب ہوتے چلے جائیں گے اور ان کی بے رخی بھی محبت پیار میں بدل جائے گی اس لئے کہ دنیا کا یہ عام دستور ہے کہ لوگ دوڑ کر وہاں ہی جاتے ہیں جہاں سے انہیں کچھ ملنے کی امید ہوتی ہے اور اُسی سے پیار کرتے ہیں جو ان کے لئے نفع بخش ہو۔

یہ غلط فہمی عام طور پر پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ "اردو مسلمانوں کی زبان ہے"۔ یہ انتہائی فرقہ پرستانہ ہے جسے تنگ نظر اور فرقہ پرست لوگوں نے اپنی گندہ ذہنیت کی تکمیل کے لئے عوام میں پھیلایا ہے تاکہ اُردو جیسی حسین و دلکش اور شیریں زبان کے مٹانے میں آسانی سے تعاون حاصل ہو سکے کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ جب جذبات کی رو میں کسی مسئلہ کو دیکھا جاتا ہے تو پھر معقولیت اور نامعقولیت کا سوال درمیان سے اُٹھ جاتا ہے اور انسان اپنی محبتی سے قیمتی چیز ضائع کرنے کے لئے آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ معاملہ اُردو کے ساتھ ہے ورنہ کون نہیں جانتا کہ اردو ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ ہے جس کی آبیاری میں ہندو مسلم دونوں نے حصہ لیا ہے۔ اس کی تخلیق و نشو و نما میں اگر ایک طرف میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، اقبالؔ، جگرؔ اور سردار جعفری ہیں تو دوسری طرف دیا شنکر نسیمؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، چکبستؔ، جوش ملسیانی، فراقؔ گورکھپوری، ملک رام، آنند نرائن ملاؔ، کرشن چندر، اور گوپال متل جیسے جانے کتنے نامور غیر مسلم ادیب و شاعر ہیں جنھوں نے اُردو کو اپنے خون جگر سے سنوارا ہے اور جنھوں نے اُردو کی ایک ہاتھ سے شائستگی کی ہے۔

ان حقیقتوں کے باوجود اگر کوئی اُردو کو ہندوستان سے اس لئے مٹانا چاہتا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو وہ تاریخ سے ناواقف ہے، انصاف پسند نہیں، ظالم ہے، انسان دوست نہیں انسان دشمن ہے، اس ملک کا اور ہندو مسلمانوں کا دشمن ہے، اس گنگا جمنی تہذیب کا دشمن ہے جو ملک کا مشترکہ تہذیبی ورثہ ہے میں ایسے تمام لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ جس طرح اُن کے آنکھیں بند کر لینے سے سورج کے وجود کی نفی نہیں ہوتی اسی طرح ان کے

اردو کی اہمیت تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہو لیکن اگر وہ ایماندار ہو تو وہ خود کے سامنے خود اُن کے اندر دوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ اردو اپنی لسانی خصوصیات کی بنا پر صرف ایک قومی زبان ہی نہیں رہ گئی ہے بلکہ وہ ایک بین الاقوامی (انٹرنیشنل) زبان بنتی جا رہی ہے۔ مثلاً سوویت روس میں اردو کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ تاشقند، سمرقند، بخارا، ماسکو اور لینن گراڈ کے بہت سے سیکنڈری اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اسی طرح حکومت امریکہ نے شکاگو اور کیلیفورنیا کے کالجوں میں اردو کو لازمی مضمون قرار دیا ہے۔ نیویارک کے فورڈھن یونیورسٹی کے ایک کالج میں داخلہ حاصل کرنے والے طلباء اردو کو بحیثیت ایک مضمون اختیار کرنے کے پابند ہیں۔ شکاگو یونیورسٹی میں اردو کا ایک علیحدہ مستقل شعبہ ہے جہاں سے "نئی صدی" کے نام سے ایک رسالہ بھی نکلتا ہے۔ ماریشس کے ۴۰ فیصد عوام کی مادری زبان اردو ہے۔ گیانا (جنوبی امریکہ) کے ۳۵٪ باشندوں کے اظہار خیال کے ذریعہ اردو ہے۔ جرمنی کی یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ نیپال کے سکنڈری ایجوکیشن بورڈ نے اردو کو اپنے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔ اسی طرح دوسرے ممالک مثلاً برما، سنگاپور، لنکا، ملیشیا، افغانستان اور سعودی عرب میں اردو بھی بولی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اگر ہندوستان کو اپنی تہذیب و ثقافت سے بین الاقوامی طور پر لوگوں کو روشناس کرانا ہے تو اس کے لئے اردو سے بہتر کوئی دوسری ملکی زبان نہیں ہے اس لئے حقیقت پسندی کا ثبوت دینا چاہئے اور اس زبان سے نفرت کرنے کے بجائے اسے سیکھنے اور فروغ دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔

ماہنامہ "تحریک" دہلی کے ایڈیٹر جناب گوپال مِتل صاحب جو اردو کے مشہور طنز و مضمون نگار اور مخلص دوست ہیں۔ انہوں نے اردو کے تعلق سے ایک مضمون میں بہت ہی حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے۔ ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ ان کے تجزیہ کو انہیں کی زبان میں آپ کے سامنے پیش کروں تاکہ اس کانفرنس کو ہم حقیقت پسندانہ طریقے سے سوچنے سمجھنے کا موقع مل جائے۔ ضروری نہیں کہ آپ ان کی تمام باتوں سے متفق ہوں مگر ان کے خیالات سے آپ کے سوچ کو ایک نیا موڑ ضرور ملے گا۔ [illegible]

"اگر اردو والے واقعی اپنی زبان کا تحفظ چاہتے ہیں تو انہیں مخالفین کا اس کرنا چاہئے۔ کوئی تحریک دباؤ کے زور پر کامیاب نہیں ہو سکتی ......

یہ بھی ایک وجہ ہے کہ سوائے چند بدطینت فرقہ پرستوں کو چھوڑ کر اکثریتی طبقہ مجموعی طور پر اردو کو اپنی زبان ماننے کے لئے تیار ہے۔ یہ کہنا غالباً صحیح نہیں ہوگا کہ ہندوؤں کی اکثریت اردو زبان سے عناد رکھتی ہے لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انہیں اردو کے تحفظ سے کوئی خصوصی دلچسپی نہیں ہے۔ کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتی جب تک اسے پُرخلوص اور سرگرم لوگوں کی تائید حاصل نہ ہو۔ یہ خلوص اور ولولہ اردو تحریک کو مسلمان ہی مہیا کر سکتے ہیں کیونکہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو ان کے ذہنی و دلی رجحانات اور ناطوں کے تقاضے میں زیادہ بہتر طور پر کر سکتی ہے اور یہ ان کی ثقافت کی علامت بھی ہے۔ میں یہ مشورہ نہیں دے رہا ہوں کہ مسلمان اردو کے بلاشرکت غیرے مالک بن بیٹھیں۔ روشن خیال غیر مسلم افراد کی تائید حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو تحریک کے بنیادی اور سرگرم معاون مسلمان ہی ہوں گے"

"یہ دلیل کچھ زیادہ وزنی نہیں کہ اگر مسلمانوں نے اردو کو اپنی زبان مان لیا تو غیر مسلم اردو کے اور بھی مخالف ہو جائیں گے۔ یہ تو ممکن ہے کہ غیر مسلم ہی زبان کی حیثیت سے اردو کی حمایت نہ کریں لیکن مسلمان اس کا تحفظ اپنی زبان کی حیثیت سے کرنا چاہیں تو انصاف پسند غیر مسلموں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے"

"مسلمانوں کا یہ جائز حق ہے کہ وہ حکومت سے اردو کے تحفظ کا مطالبہ کریں یہ مطالبہ بنیادی حقوق کی بنیاد پر کیا جانا چاہئے۔ سیکولرزم اور مشترکہ تہذیب کے نام پر۔ اس بات کا امکان ہے کہ حکومت اردو والوں کے جائز حقوق کو مان لے لیکن اگر ایسا نہ ہو تب بھی مسلمان اپنی کوششوں سے اردو کو بچا سکتے ہیں۔ میں باور کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ کروڑ افراد کا ایک فرقہ اپنی زبان کا تحفظ نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ اس کا مصمم ارادہ کرے"

اسی مضمون میں انہوں نے ایک جگہ بڑی ہی تلخ حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے اور بڑی جرات دکھائی ہے [illegible] کہیں ہے مجھے ڈر ہے کہ آدمی آسانی سے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس میں اردو کے حامیوں اور مصنفان حضرات کی گروہ کی بہت اچھی نقاب کشائی کی ہے جو اردو کے بہت بڑے اور پرجوش حامی سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایسے ہی حضرات کی وجہ سے اردو کے کاز کو نقصان پہنچ رہا ہے اور منزل مقصود ہاتھ میں نہیں آتی۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس کانفرنس کے مندوبین اور حامیان اردو کو جناب گوپال متل صاحب کے احساسات و تاثرات کے بالکل پر منکشف ہو جائے تاکہ یہ کانفرنس اردو کے سلسلہ میں کچھ تعمیری اور مثبت رول ادا کر سکے۔ لکھتے ہیں:-

"ریاکاری ہمارا شیوہ ہے لیکن جو لوگ ان دنوں اردو کے حامی بنے ہوئے ہیں وہ کچھ زیادہ ہی ریاکار ہیں۔ وہ اردو کی حمایت میں پرجوش تقریریں کرتے ہیں اور مضامین لکھتے ہیں لیکن ان تقریروں اور مضامین کے آخر میں چپکے سے ایک ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو ان کی تمام ابتدائی باتوں کی نفی کرتی ہے"

برادران عزیز!

زندگی تار حریر دو رنگ سے عبارت ہے۔ نور و ظلمت اور کشمکش [illegible] زندگی کا اصل لطف پوشیدہ ہے۔ عشق و خلوص کے جوہر انہیں [illegible] سے کھلتے ہیں۔ جہاں مصائب و تکالیف ہوتی ہیں وہیں جذبۂ اندروں میں گرمی اور تڑپ پیدا ہوتی ہے اس لئے آج چاہے حالات کتنے ہی ناساعد معلوم ہوتے ہوں اگر ہمارے اندر دوں میں اردو کے لئے سچی لگن ہے اور ہم انصاف اور معقول طریقے سے اپنی بات پیش کرتے ہیں تو حالات خود بخود بدلیں گے اس لئے کہ انسانی فطرت کو اس کے اصلی مزاج سے زیادہ دنوں تک دور نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے باشندے عام طور پر اپنی فطرت کے لحاظ سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ نرم دل اور [illegible] رکھتے ہیں اس لئے ہمیں اردو کے سلسلہ میں ان کے تعاون سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں البتہ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم ان سے قریب تر ہوں اور [illegible] انہیں ختم کریں ان سے دور رہ کر ان کے تعاون کی امید رکھنا [illegible] گو [illegible]

اسی نشست میں آپ کو [illegible] پر اظہار خیال کرنا ہے۔ [illegible] کسی قدر مشترک کی تلاش کرنا ہے تاکہ تجاویز کی شکل دی جا سکے۔ ہو سکتا ہے کوئی فرد آپ کے خیالات سے متفق نہ ہو اور وہ چند دلائل کی بنا پر آپ سے اختلاف کرے۔ ہمیں دوسروں کی باتوں کو خوش دلی سے برداشت نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی کسی جذباتیت کا شکار ہونا چاہئے کیونکہ بہت سے اچھے اور مفید کام بعض وقت جذباتیت کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں۔ ہمیں کون سے دوسروں کا نقطۂ نظر سننا ہے اس کی اچھی باتوں کو قبول کرنا ہے اور جو ناپسندیدہ ہوں انہیں احسن طریقہ سے رد کر دینا ہے۔ جمہوریت اور جمہوری طریقہ کار کی یہی اصل روح ہے جسے ہر طرح [illegible] میں ملحوظ رکھنا چاہئے تاکہ تبادلۂ خیال کی راہیں کھلی رہیں اور مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کے ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ میں امید کرتا ہوں کہ تمام مندوبین کانفرنس اسی متوقع روشنی کا ثبوت دیں گے۔

آخر میں ایک بار پھر حکومت [illegible] اور اہل ریاست دونوں کو ان کی وسعت نظری اور انصاف پسندی پر مبارکباد دیتا ہوں جس کی وجہ سے اس کانفرنس کا انعقاد ہو سکا۔ میں داعیان کانفرنس اور مندوبین و حاضرین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے قدر و منزلت بخشی اور سکون کے ساتھ میری معروضات سنیں۔ ہو سکتا ہے میری غیر سیاسی اور حقیقت پسندانہ باتیں آپ کو تلخ لگی ہوں مگر میں آپ سے یہ عرض کر کے رخصت ہونا چاہوں گا کہ ؎

جن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی
(اقبالؒ)

خدا حافظ

تعمیر حیات کے قارئین سے

(۱) دفتر تعمیر حیات سے بہ پابندی رسالہ روانہ کیا جاتا ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ڈاک کی بد انتظامی اور نامکمل پتہ کی وجہ سے بعض حضرات کو پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت ہو جاتی ہے۔ ایسے حضرات سے ہماری گذارش ہے کہ وہ ہمیں تحریری اطلاع کے ساتھ اپنا مکمل اور واضح پتہ بھی بھیجا کریں۔ پتہ اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی لکھا جائے۔ خریداری نمبر بھی اگر ممکن ہو تو دے دیں۔

(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی خط ارسال کریں۔

(منیجر تعمیر حیات)

Regd No. LW/NP 56
Phone 22345 / 29747
TAMEER-E-HAYAT
Fortnightly
NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

مجمع بحار الانوار

(احادیث کی مشکلات حل کرنے کی بے نظیر کتاب)

ہندوستان میں

مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلی تیل، نقلی کیمیکل اور حیوانی کیمیکل سے بچئے!

نورانی تیل

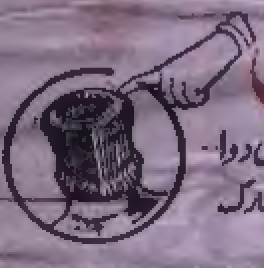

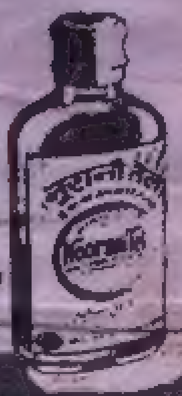

درد، زخم، چوٹ، جلنے، کٹنے کی دوا۔
اب سنہرے اور ہرے رنگ کے لیبل پر ٹریڈ مارک
دیکھ کر خریدیے۔

انڈین کیمیکل کمپنی

ہند تیل

ہند سی بی ورکس

تعمیرِ حیات

میں

اشتہار دیکر

اپنی تجارت

کو

فروغ دیجئے

شربت نزلہ

معمولی
کھانسی، زکام
اور نزلہ کے لیے

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

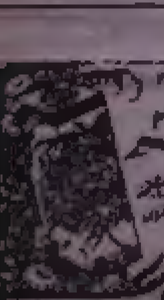

عطر مجموعہ نمبر ۳۹۱۸

حافظ محمد زکریا برادران تاجران عطر قنوج

بہترین چائے کا قابلِ اعتماد مرکز

عباس علاء الدین اینڈ کمپنی

اسپشل مکچر	کپ برانڈ
اسپشل ممری	گولڈن ڈسٹ
نمبرل مکچر	فلاوری او پی

AA

TELEGRAM — CUP, KATTLY

PHONE No. 35

بمبئی نمبر ۳